جلد ۸۳ جولائی ۱۹۷۵ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ہماری تازہ ترین مطبوعات

○ عیسائیت انجیل اور قرآن کی روشنی میں

از عبدالوحید خان

- جدید عیسائیت اور بائیبل کا انجیل مقدس ہی کی روشنی میں خالص علمی تجزیہ
- مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ کے لٹریچر میں گرانقدر اضافہ

سائز ۱۸ × ۲۳/۸ —— صفحات ۳۱۲ —— قیمت ۱۵/- روپے

○ اسلامی معیشت کے چند نمایاں پہلو

از محمد محترم فہیم عثمانی (ایم اے)

- جدید معاشی مسائل کا بصیرت افروز تجزیہ، مدلّل اور مفصل تشریح۔
- معاشیات کے طلبہ اور محققین کے لیے نادر پیشکش

سائز ۲۰ × ۳۰/۱۶ صفحات ۲۵۶ قیمت ۹/- روپے

○ تقسیمِ میراث

از سید شوکت علی

- عام فہم اور سلیس زبان میں علم الفرائض کی تشریح و توضیح۔
- جدید حسابی قاعدوں اور مثالوں سے وضاحت۔
- علماء اور عام مسلمانوں کے لیے بے نظیر کتاب۔

سائز ۱۸ × ۲۳/۸ صفحات ۱۲۸ قیمت ۷/۲۵ روپے

○ اوراقِ گم گشتہ (علامہ اقبال کی غیر مدون تحریریں)

از رحیم بخش شاہین (ایم اے)

- ایسی تحریریں جو پہلی مرتبہ علامہ اقبال کے متعلق اس مجموعے میں شامل کی جا رہی ہیں۔
- اپنے موضوع پر ایک مسباری کتاب۔

سائز ۱۸ × ۲۳/۸ صفحات ۴۷۲ قیمت ۲۸/- روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۔ ۱۳۔ ای، شاہ عالم مارکٹ لاہور ۔ فون نمبر ۶۸۳۴۱

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جولائی ۱۹۷۵ء مطابق جمادی الآخرۃ ۱۳۹۵ھ	جلد ۸۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

زر سالانہ بارہ روپے۔ فی پرچہ ۲۵/ ۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جب کسی بدنصیب شخص کے پاؤں دو کشتیوں میں ٹکے ہوئے ہوں اور انہیں کھینے والے انہیں دو متضاد سمتوں میں لے جانے کا عزم رکھتے ہوں تو ان میں پاؤں رکھنے والا اگر ساحلِ مراد پر پہنچنے کے بجائے لہروں کی نذر ہو جائے تو یہ انتہائی دکھ کی بات تو ضرور ہے مگر کسی اعتبار سے باعث حیرت نہیں۔ انسان کو استعجاب تو اس بات پر ہوتا ہے جو توقع کے بالکل برعکس ظہور پذیر ہو لیکن اگر نتیجہ، خواہ کتنا ہی ندامتناک ہو، توقع کے عین مطابق برآمد ہو رہا ہو تو انسان اُسے دیکھ کر کرب تو محسوس کرتا ہے مگر حیرت زدہ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر آپ کراچی جانے کا عزم کرتے ہیں اور اس غرض کے لیے کراچی کا ٹکٹ خریدتے ہیں اور اپنی دانست میں کراچی جانے والی گاڑی میں بیٹھ کر سفر کا آغاز کرتے ہیں اور آٹھ دس گھنٹے گذر جانے کے بعد آپ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ آپ کراچی کے بجائے پشاور کے قریب پہنچ رہے ہیں تو اس انکشاف سے آپ نہ صرف پریشان ہوں گے بلکہ حیرت زدہ بھی ہوں گے کیونکہ آپ منزلِ مقصود سے قریب تر ہونے کے بجائے اس سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔

قریب قریب یہی ذہنی افتاد ان انسانی قافلوں یا جماعتوں پر پڑتی ہے جو چند مخصوص مصالح کے تحت عوام کی زیادہ سے زیادہ بھیڑ اپنے اردگرد جمع کرنے کی غرض سے ایسے نعرے لے کر اُٹھتے ہیں جو الفاظ اور معانی دونوں اعتبار سے ایک دوسرے کے نقیض ہوتے ہیں۔ ایسی جماعتیں یا گروہ اگر چند قدم چلنے کے بعد انتشار کا شکار ہو جائیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ خلفشار سے محفوظ رہ جائیں تو اس پر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ متوقع نتیجہ ظاہر ہونے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔

ہمارے ملک میں یوں تو کوئی ایسی سیاسی جماعت معرض وجود میں نہیں آئی جس نے نظریاتی اساس پر اپنے آپ کو منظم کر کے عوام کے اندر اثر و نفوذ پیدا کیا ہو اور پھر عوام کی تائید سے مسند اقتدار پر متمکن ہوئی ہو لیکن خاص طور پر سکندر مرزا کے عہد اقتدار سے جتنی سیاسی جماعتیں بھی تخت اقتدار پر براجمان ہوئی ہیں وہ خود اقتدار کی پیداوار ہیں جنہیں کسی صاحب اختیار نے اپنی ضرورت کے لیے منظم کیا اور جب اس کی وہ ضرورت پوری ہو گئی تو وہ خود بخود اس طرح معدوم ہو گئیں کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا۔ سکندر مرزا اپنے عہد اقتدار کو زیادہ سے زیادہ طول دینے اور اپنے اختیارات کو غیر محدود بنانے کے لیے وہ سارے حربے استعمال کرتا رہا جو اس کے پیشرو ملک غلام محمد نے کیے تھے۔ لیکن اس نے یہ محسوس کیا کہ جب تک کوئی سیاسی جماعت اس کی باندی بن کر اس کی خدمت اور چاکری کا فرض انجام دینے کے لیے میدان میں نہ اترے اس وقت تک اس کے دلپسند سیاسی عزائم کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس غرض کے لیے اس نے ریپبلکن پارٹی کی تشکیل کی۔ ظاہر بات ہے کہ جو جماعت نہ تو کسی صحت مند نظریے کی بنیاد پر اور نہ کسی رفیع و اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر معرض وجود میں آئے بلکہ جس کی تشکیل کی غایت صرف یہ ہو کہ کسی صاحب اختیار کے لیے بطور آلہ کار استعمال کی جا سکے وہ جماعت ملک و ملت کی بہبود کے لیے کیا کام کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس پارٹی کا دائرہ کار سکندر مرزا اور اس کے حواریوں کی مدح و ستائش تک محدود رہا اور جب "بڑے صاحب" مسند اقتدار سے محروم ہو گئے تو اس پارٹی کا وجود بھی عنقا ہو گیا۔

سکندر مرزا کے بعد مارشل لا کے ذریعہ عنان اقتدار پاکستان کی بری فوج کے سربراہ کے ہاتھ میں منتقل ہوئی۔ یہ صاحب چار برس تک مارشل لا کی اندھی بہری قوت سے تنہا امور مملکت چلاتے رہے لیکن جب ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ انہیں اپنے کارناموں کی تعریف و توصیف کے لیے اور عوام کے ذہنوں پر اپنی شخصیت کا طلسم قائم کرنے کے لیے کچھ پیشہ ور قصیدہ خوانوں، کچھ زوردار نعرہ لگانے والوں، اور ان کے لیے جلسے منعقد کر کے انہیں سپاس نامے پیش کرنے والوں کی ضرورت ہے جو ہر لمحہ اور ہر حال میں ان کے دعاگو ہوں بلکہ ان کی حمد و ثنا کو جزو ایمان سمجھتے ہوں، تو انہوں نے مسلم لیگ میں سے ایک حصہ الگ کر کے کنونشن لیگ کے نام سے ایک نئی جماعت کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ اعلان کا ہونا تھا کہ اقتدار کے پجاری اور دنیوی مفادات کے پرستار جو فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کی قربت اور سرپرستی حاصل کرنے

کے لیے سخت بیتاب تھے وہ جوق در جوق اس جماعت میں شامل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ارکان کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر کے لاکھوں تک جا پہنچی۔ ہر سطح پر جماعت کے چھوٹے بڑے لیڈر اُبھرنے لگے اور سرکاری اخبارات میں اُن کے بیانات، جو الفاظ کے معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ سربراہ مملکت کے حضور میں اپنی نیازمندی کا یقین دلانے کے لیے ہی ہوتے تھے، نمایاں طور پر شائع ہونے شروع ہوئے۔ کنونشن لیگ کے کارکنوں اور اُن کے قائدین کی سرگرمیوں کو اخبارات میں دیکھ کر ایک عام تاثر یہی پیدا ہوتا تھا کہ اس جماعت کا جال پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی سرگرمیاں پوری زندگی پر محیط ہیں اور اس کی جڑیں عوام کے دل و دماغ میں اچھی طرح اُتر چکی ہیں۔ فیلڈ مارشل صاحب کی ہمہ مقتدر ذات بھی اسی خوش فہمی میں گرفتار نظر آتی تھی لیکن جو لوگ سیاسی معاملات کی کوئی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ اس جماعت کو اپنے سارے شکوہ کے باوجود محض ریت کا ایک گھروندا سمجھتے تھے جو فیلڈ مارشل صاحب کے اقتدار کے ساتھ قائم تھا اور اُن کے تختِ اقتدار سے ہٹتے ہی درہم برہم ہونے والا تھا۔ ان حضرات کے یہ خدشات حقائق کے گہرے مطالعہ پر مبنی تھے جن کا تذکرہ آج بھی اتنا ہی ضروری معلوم ہوتا ہے جتنا کہ پہلے ادوار میں۔

نوع انسانی کی طویل تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسانوں کی پائیدار شیرازہ بندی کے لیے یہ بات از حد ضروری ہے کہ یہ شیرازہ بندی کسی صحت مند نظریاتی اساس پر کی جائے۔ اس حقیقت کی طرف اس عارف ربانیؓ نے اُن پر آشوب حالات میں جب اس کائنات کی عظیم ترین ہستی دنیا سے رخصت ہوئی، یہ کہہ کر اشارہ فرمایا:

ایھا الناس، انہ من کان	اے لوگو! (جان لو) کہ جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
یعبد محمدا فان	کی پرستش کرتا تھا (اسے سمجھ لینا چاہیے) کہ
محمدا قد مات، ومن	محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں اور جو
کان یعبد اللہ فان اللہ	کوئی اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اللہ زندہ
حی لا یموت۔	جاوید ہے اور اسے موت نہیں آتی۔

ان الفاظ کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا کچھ نہیں

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	کہ بس ایک رسول ہیں ، اُن سے پہلے اور رسول
اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	بھی گذر چکے ہیں ۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل
عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ ۔	کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے

آل عمران - ۱۴۴

خلیفہ راشدؓ کی اس تصریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندہ و پائندہ رہنے والی چیز صحت مند اصول اور نظریہ ہے ، کسی فرد کی زندگی نہیں ۔ فرد کو بھی اگر حیات جاوید ملتی ہے تو اُس نظریے اور اصول کے طفیل جسے وہ اپنی ناسوتی زندگی میں سربلند کرنے کے لیے اپنی ساری قوتیں اور توانائیاں کھپا دیتا ہے ۔ انسانیت کے ارتقا اور ترقی میں فرد کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ عظیم افراد کی قوتِ فکر ، جوشِ عمل اور ایثار ہی سے نظریات اور اصولوں کو غلبہ حاصل ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ان عظیم افراد کی عظمت کا راز بھی اس بات میں مضمر ہے کہ ان حضرات نے اپنے ان اصول و نظریات کو ، جن پر وہ ایمان رکھتے تھے ، دنیا کی غالب قوت بنانے کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی متاع قربان کر دی اور اگر انہیں اس راہ میں زندگی کی بازی بھی لگانا پڑی تو انھوں نے اس سے قطعاً گریز نہ کیا بلکہ اُسے اپنی بہت بڑی سعادت سمجھتے ہوئے اس انکسار کے ساتھ جان نثار کی گویا کہ وہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں ۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جو افراد ، جماعتیں یا گروہ اصول و نظریات سے وابستگی پیدا کرنے کے بجائے اشخاص سے وابستہ رہنا پسند کرتے ہیں خصوصاً جب وہ مسندِ اقتدار پر متمکن ہوں ، ممکن ہے وہ اپنے لیے چند حقیر قسم کے مادی فوائد حاصل کرنے میں تو کامیاب ہو جائیں لیکن وہ ملک و ملت کے لیے ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں ۔ ہر چڑھتے ہوئے سورج کا پرستار نہ صرف اپنی تذلیل کا سامان فراہم کرتا ہے بلکہ انسان کی تذلیل کا باعث بنتا ہے اور خود سورج کے لیے بھی کوئی نیک فال ثابت نہیں ہوتا ۔ "آفتاب" کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس کی کرنوں کا مختلف طبقات پر کیا ردّ عمل ہوتا ہے تو وہ لازمی طور پر اپنی کرنوں کو زیادہ سے زیادہ حیات آفرین بنانے کی کوشش کرے گا تاکہ اس کے غروب ہو جانے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں ان کی یاد باقی رہے ۔ لیکن اگر ہر طلوع ہونے والا آفتاب پرستاروں کے جھرمٹ ہی میں طلوع ہو اور جب تک اس کے غروب

ہونے کے آثار بالکل نمایاں نہ ہوجائیں، اس وقت تک وہ لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہی دیکھے تو اسے اپنی اس "خدمت جلیلہ" کے بارے میں عوام کے صحیح ردّعمل کا کس طرح اندازہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اقتدار کا آفتاب جس انداز سے چاہتا ہے عوام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور وہ بیچارے دم بخود ہوکر اس کے زوال کے منتظر رہتے ہیں اور جب وہ زوال سے دوچار ہوجاتا ہے تو انہیں اطمینان کا سانس نصیب ہوتا ہے۔ اس نیازمندانہ بلکہ احمقانہ طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چند سالوں ہی میں پوری قوم بے ضمیر افراد کا ٹولہ بن کر رہ جاتی ہے جو ہر بُرائی کو اپنے آپ پر مسلط کرنے پر تیار نظر آتی ہے بشرطیکہ وہ بُرائی اقتدار کے ہاتھوں اس کی طرف منتقل ہو رہی ہو۔

آپ قوموں کے عروج وزوال کی داستان پر اگر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت آپ پر منکشف ہوجائے گی کہ کسی قوم کو عروج اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے افراد کسی نظریے کی صحت پر ایمان لاکر اور اُس کے ساتھ سچی وابستگی پیدا کرکے اور عزم راسخ کے ساتھ اس کے غلبے کے لیے بھرپور جدوجہد شروع کریں اور اسے زوال اس وقت آتا ہے جب اس نظریے سے اُن کی دلبستگی ختم ہونے لگے اور دنیوی مفادات کا حصول ان کا منتہائے مقصود بن جائے۔ مادی مفادات کا پرستار لازمی طور پر اقتدار کا پجاری ہوتا ہے کیونکہ ان مفادات کا سب سے بڑا سرچشمہ اقتدار ہی ہوتا ہے۔ مفادات اور اقتدار کی پرستش سے افراد کی سیرتیں کمزور، اُن کے عزائم پست اور قومی سطح پر اُن کی صفوں میں انتشار پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ اخلاقی امراض کسی قوم کو اسی طرح کھوکھلا کردیتی ہیں جس طرح تپ دق کا مرض کسی انسان کی توانائی چاٹ لیتا ہے۔ یہ انحطاط اگرچہ دفعتاً نمودار نہیں ہوتا لیکن معمولی بصیرت رکھنے والے لوگ بھی ان اخلاقی اور روحانی عوارض سے اس بات کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ قوم جسے یہ مرض لاحق ہے وہ سرنگوں ہونے والی ہے اور اس زوال سے اسے کوئی معاشی تدبیر یا کوئی سیاسی شعبدہ بازی نہیں بچا سکتی۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ مسلمانوں کو کس روگ نے تباہ کیا ہے تو اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اسلام کے ساتھ محبت اور عقیدت کے دعوے کے باوجود اس سے بے رغبتی اور دنیاوی مفادات کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی رغبت اور دلچسپی یہ ایک ایسا روگ ہے جس نے اس "امت" کو خدا اور خلق

دونوں کی نظروں میں رسوا کیا ہے۔ خدا کی نظر میں تو ہم اس لیے ذلیل ہیں کہ زبان کی حد تک تو ہم اس بات کا اعتراف کرتے رہتے ہیں کہ اے خالق تو ہی ہمارا الٰہ اور معبود ہے، تیرا عطا کردہ دین ہی ہماری دنیوی فلاح اور اُخروی کامرانی کا ضامن ہے، تیرا رسول ہی ہدایت کا واحد سرچشمہ ہے اور اس کی محبت اور پیروی ہی سے ہم دنیا اور آخرت میں فائز المرام ہو سکتے ہیں لیکن ان بدیہی حقائق کے اعتراف کے بعد جب ہم زندگی کے عملی میدان میں اُترتے ہیں تو ہم اپنے اعمال سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہمیں خدا کی رضا مطلوب نہیں بلکہ مادی مفادات عزیز ہیں۔ ہم اپنے خالق اور مالک کی نظرِکرم کے محتاج نہیں بلکہ اقتدار کی نگاہ التفات کے دست نگر ہیں، ہماری کامیابی اور کامرانی دینِ حق کی اطاعت سے وابستہ نہیں بلکہ ان افکار و نظریات کی رہینِ منت ہے جو ہمارے اصحابِ اقتدار اور ان کے منظورِ نظر دانشوروں نے اہل مغرب سے مانگ تانگ کر ہمیں دیے ہیں۔ ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پہ ناز نہیں بلکہ مغربی ملحدین کی دریوزہ گری پر فخر ہے۔ قول و فعل کا یہ خوفناک تضاد ہماری بربادی اور ذلت و خواری کا واحد سبب ہے۔ خدا ہم سے اس لیے ناراض ہے کہ ہم اس کے ساتھ جو عہد و پیمان باندھتے ہیں اسے ہر قدم پہ توڑتے ہیں اور خلق ہم سے اس لیے خفا ہے کہ ہم اپنی زندگی کا کوئی اصول اور نظریہ نہیں رکھتے۔ ہم متضاد نعروں اور متضاد طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہم کسی اصول کے علمبردار نہیں بلکہ بے ضمیر افراد کا ایک ٹولہ ہیں جسے اقتدار کے اشارہ ابروئے چشم پر رقص کرنے کے علاوہ اور کسی چیز کی تربیت حاصل نہیں۔ اس قسم کے طالع آزماؤں کے لیے کسی دل میں عزت و احترام کا کونسا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ دنیا کی یہ ریت ہے کہ یہاں ایک بااصول کافر کی پذیرائی تو ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی اصول پرستی کی بنا پر اس پر کسی حد تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے لیکن ایک بے اصول اور بے ضمیر خدا پرستی کے اُس دعویدار کے لیے عزت کا کوئی مقام پیدا نہیں ہو سکتا جس کے اعمال اس کے دعوے کی تردید کرنے والے ہوں۔ جو شخص خدا کے مقدس نام پر لوگوں کو دھوکہ دینے سے باز نہیں رہتا اس پر خدا کی مخلوق کس طرح اعتماد کر سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا میں جس قدر رفعت اور سربلندی خدا پرست قوموں کو حاصل ہوئی ہے وہ ملحد اقوام کو حاصل نہیں ہوئی لیکن جب ان مذہبی قوموں نے خدا پرستی کے مسلک کو چھوڑ کر دنیا پرستی کو اپنا شعار بنایا تو جس قدر ذلت و خواری اِن قوموں کے حصے میں آئی اس کی نظیر دوسری قوموں میں کم ہی ملتی ہے۔

پاکستان جو بڑی مقدس آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا تھا اسے نفاق کے اس جان لیوا

مرض نے ہی تباہ کیا ہے۔ اس نیم برصغیر کے مسلمانوں نے خدا اور خلق دونوں کو گواہ بنا کر یہ اقرار کیا تھا کہ اگر انہیں ایک الگ خطۂ ارضی حاصل ہو جائے تو وہ اسے اسلام کا گہوارہ بنائیں گے لیکن جن افراد کے ہاتھوں میں اس ملک کی عنانِ اقتدار رہی انہوں نے اس بات کی سر توڑ کوشش کی کہ اس ملک پر کسی طرح اسلامی نظام کی پرچھائیں نہ پڑنے پائیں۔ اہلِ پاکستان کے لیے اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہاں جو جماعت اور گروہ اقتدار کے حصول کے لیے آگے بڑھا اُس نے اسلام کے نام پر مسندِ اقتدار پر قبضہ کیا لیکن جس وقت اسے یہ مقام حاصل ہو گیا تو پھر اُس نے حکومت کے سارے وسائل اسلام کی راہ روکنے کے لیے صرف کرنے شروع کر دیے۔ اس قسم کا طرزِ عمل انتشار اور خلفشار تو پیدا کر سکتا ہے، اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ دو چار سال کی حکمرانی کے بعد جب وہ گروہ رسوا ہو کر اقتدار سے محروم ہوا تو پھر اقتدار کے نئے اُمیدواروں نے اسلام کی خدمت کے نام پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کی کوشش کی اور جب اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تو اُس نے بھی خدمتِ اسلام کے بجائے اسلام کے خلاف سازشوں کا وسیع جال پھیلا دیا۔

بعض لوگ حکمرانوں کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر اسلام کی محبت کا دم بھرنے والے یہ مسلمان فرمانروا برسرِ اقتدار آجانے کے بعد اسلام کے خلاف معاندانہ روش کیوں اختیار کرتے ہیں؟ یہ سوال بظاہر بڑا معقول نظر آتا ہے لیکن حالات کے سطحی مطالعے اور غلط تجزیے پر مبنی ہے۔ اسلام کی "محبت کا دم بھرنے والوں" کی زندگیاں اقتدار سے پہلے بھی خدا کے باغیوں کا نقشہ پیش کرتی ہیں اور انہیں دیکھ کر کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ اس نوعیت کی زندگیاں بسر کرنے والے خدا کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہو سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کا جو کمال ہے وہ صرف یہ کہ ایک کامیاب فنکار کی طرح عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لیے بوقتِ ضرورت اسلام اور قرآن سے اپنی شیفتگی ظاہر کرتے رہتے ہیں اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کے دین سے بیزاری کا اظہار شروع کر دیتے ہیں البتہ بیزاری کا اظہار بھی بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے کیا جاتا ہے تاکہ عام لوگوں کو اس کا احساس نہ ہو۔ مثلاً یہ تاثر پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام دورِ جدید کے مسائل کو بطریقِ احسن حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یہ اب قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسا جامہ ہے جسے عہدِ حاضر کی قامت پر راست نہیں (باقی برصفحہ ۷۴)

فصل پنجم

اخلاقی تعلیمات

(۳)

جامع اخلاقی ہدایات ان برائیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ قرآن میں پے در پے ایسی جامع اخلاقی ہدایات دی گئیں جن کی خوبی دلوں میں کھُب جانے والی تھی، اور کسی سلیم الطبع انسان کے لیے ان کو برحق ماننے بغیر چارہ نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ یہ اِس بنا پر اور بھی زیادہ پُرکشش تھیں کہ انہیں صرف بیان ہی نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اِن کو پیش کرنے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے لوگ رضی اللہ عنہم عملاً ان پر کاربند تھے۔ ذیل میں ہم ان کو سلسلہ وار نقل کرتے ہیں:

—— "اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کرو" (النحل ۹۰)۔

—— "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ کہ اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں رزق دیتے ہی ہیں، اُن کو بھی دیں گے۔ اور فحش کاموں کے قریب نہ جاؤ خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے قتل نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اُس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رُشد کو پہنچ جائے۔ اور انصاف کے ساتھ ناپو اور تولو۔ ہم کسی شخص پر ذمہ داری کا اُتنا ہی بار ڈالتے ہیں جتنا اُس کے امکان میں ہے۔ اور جب بولو تو انصاف کی بات کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کی نصیحت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سبق لو" (الانعام ۱۵۱-۱۵۲)۔

______ "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو ان کو اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان کے ساتھ احترام سے بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار اُن پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔ اور رشتہ دار کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اُس کا حق۔ اور فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اور اگر تمہیں اُن سے (یعنی حاجت مندوں سے) اِس بنا پر پہلوتہی کرنی پڑے کہ ابھی تم اللہ کی اُس رحمت کو جس کے تم اُمیدوار ہو تلاش کر رہے ہو، تو اُنہیں نرمی کے ساتھ جواب دو۔ اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ رکھو (کہ بخل کرنے لگو) نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دو (کہ بے اندازہ خرچ کرنے لگو) اور ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے حال سے خوب باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بہت بڑی خطا ہے۔ اور زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت فحش کام اور بڑا ہی برا راستہ ہے۔ اور قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق دیا ہے، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اُس کی مدد کی جائے گی۔ اور مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کرو، یقیناً عہد کے بارے میں بازپرس ہونے والی ہے۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔ اور کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب کی بازپرس ہونی ہے۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ اِن امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تمہارے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو (اے نبی) تمہارے رب نے تم پر وحی کی ہیں" (بنی اسرائیل ۲۳ تا ۳۹)۔

——— ”اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایے سے، پہلو کے ساتھی سے (یعنی ہم نشین ساتھی سے یا جس سے وقتی طور پر آدمی کا ساتھ ہو جائے)، مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمھاری ملکیت میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو“ (النساء ۳۶)۔

——— ”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف (یعنی چند ظاہری مذہبی رسموں کو ادا کر دیا)۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ اور روزِ آخر اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں کو سچے دل سے مانے، اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مدد مانگنے والوں کو دے اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں جو معاہدہ کریں تو اپنے عہد کو وفا کریں اور تنگی و مصیبت میں صبر کریں اور (حق و باطل کی) جنگ میں ثابت قدم رہیں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی متقی ہیں“ (البقرہ ۔ ۱۷۷)۔

——— ”یقیناً فلاح پائی اُن ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، جو لغویات سے دُور رہتے ہیں، زکوٰۃ (پاکیزگی) کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی (عریانی اور بدکاری) سے حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں کے کہ ان پر (محفوظ نہ رکھنے میں) وہ قابل ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ اور (فلاح پائی اُن ایمان لانے والوں نے) جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں، اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں“ (المومنون ۱ تا ۹)۔

——— ”رحمان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل اُن کے مُنہ آئیں تو کہتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب کو ہم سے پھیر دے، اُس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے۔ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہیں پکارتے، اور کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے جسے اللہ نے حرام کیا ہے، اور زنا نہیں کرتے۔ یہ کام جو کوئی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا، اِلّا یہ

کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔ اور (رحمان کے اصلی بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے، اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ جنہیں اُن کے رب کی آیات سُنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔ جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا" (الفرقان ۶۳ تا ۷۴)۔

—— "جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے، اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہی بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بچتے ہیں۔ اگر کبھی انہیں غصّہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں۔ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں، اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں[1]، اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بُرائی کا بدلہ اُتنی ہی بُرائی ہے (جتنی کی گئی ہو)، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو صبر کرے اور درگزر کر جائے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے" (الشوریٰ ۳۶ تا ۴۳)۔

—— "انسان تھُڑدلا پیدا کیا گیا ہے: جب اس پر مصیبت آتی ہے تو جزع فزع کرنے لگتا ہے اور

---

[1] رزق سے مراد رزق حلال ہے۔ قرآن میں کہیں حرام مال کو اللہ کا رزق نہیں کہا گیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اوّل تو جو رزقِ حلال ہم نے ان کو دیا ہے اسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات کے لیے حرام مال پر ہاتھ نہیں مارتے، دوسرے اُسی رزق کو سینت سینت کر نہیں رکھتے بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں، تیسرے یہ کہ اس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ذات ہی کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔

جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے[1]۔ جو روزِ جزا کو سچ مانتے ہیں اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو۔ جو اپنی شرم گاہوں کی (عریانی اور بدکاری سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے (جن سے محفوظ نہ رکھنے میں) ان پر کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس کرتے ہیں۔ جو اپنی گواہیوں میں راستبازی پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں (المعارج ۱۹ تا ۳۴)

——— (اہل جنت وہ لوگ ہیں) "جو اپنی نذر[2] پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ جو اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف اللہ کے لیے کھلا رہے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکریے کے طالب نہیں ہیں، ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا ڈر ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا" (الدھر ۷ تا ۱۰)۔

——— "دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف لے جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، جو اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو خوشحالی اور تنگ حالی، ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی بُرا کام اُن سے سرزد ہو جاتا ہے یا (کسی گناہ کا ارتکاب کر کے) وہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون گناہوں کا معاف کرنے والا ہے؟ وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے" (آل عمران ۱۳۳ تا ۱۳۵)۔

---

[1] یعنی انہوں نے طے کر رکھا ہے کہ اپنے مالوں میں سے اِتنا سائل اور محروم کا حق ہے جسے وہ ادا کرتے رہیں گے۔ سائل سے مراد وہ محتاج شخص ہے جو اُن سے مدد مانگے۔ اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جس کے متعلق اُن کو معلوم ہو جائے کہ یہ بیچارا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے رزق پانے سے محروم رہ گیا ہے۔ وہ خواہ مانگنے نہ آئے، مگر یہ اس کی حالت سے واقف ہونے کے بعد خود جا کر اُس کی مدد کرتے ہیں۔

[2] نذر سے مراد کوئی ایسا نیک کام ہے جسے آدمی نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرنے کا خود عہد کیا ہو۔

فضائلِ اخلاق کی تعلیم | یہ جامع اخلاقی ہدایات بجائے خود ایسی تھیں جن سے کوئی صلاحیت پسند انسان، جس میں کچھ بھی اخلاقی حس اور خیر و شر کی تمیز موجود تھی، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ لیکن قرآن نے صرف انہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ فضائل اخلاق میں سے ایک ایک کو نمایاں کر کے بتایا کہ اسلام انسان کو کن بھلائیوں سے آراستہ کرنا چاہتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے عملاً یہ دکھا دیا کہ وہ بھلائیاں صرف زبان سے کہنے کی ہی نہیں ہیں بلکہ اسلام نے جس زندگی میں بھی راہ پائی ہے وہ ان بھلائیوں سے آراستہ ہو گئی ہے۔ یہاں ان سب کو تفصیل کے ساتھ نقل کرنا مشکل ہے، اس لیے ہم ان میں سے چند کو بطور مثال نقل کرتے ہیں۔

— "نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے" (المائدہ-۲)۔

— (حضرت موسیٰؑ نے) "عرض کیا کہ میرے رب، جو احسان تو نے مجھ پر کیا ہے اس کے بعد میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا" (القصص ۱۷)۔

— "بُرائی کی مدافعت ایسی بھلائی سے کرو جو بہتر ہو۔ جو باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔ تم دعا کرو کہ اے میرے پروردگار میں شیطان کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں" (المومنون ۹۶ تا ۹۸)۔

— "وہ بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب بیہودہ بات اُنھوں نے سُنی تو اس کا جواب دینے سے پرہیز کیا اور کہا کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہتے" (القصص ۵۴-۵۵)۔

— "وہ آخرت کا گھر (یعنی جنت) ہم اُن لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں" (القصص ۸۳)۔

— (یہ اہل ایمان وہ لوگ ہیں) "جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے روکیں گے" (الحج-۴۱)۔

— (اللہ کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) "اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا، اور جن

میں اپنے نام کے ذکر کا اللہ نے اذن دیا ہے - ان میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اِقامتِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی ، وہ اُس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اُلٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی" (النور - ۳۶ - ۳۷) -

——— " اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں - جو لوگ ایسا کریں گے وہی خسارے میں رہنے والے ہیں" (المنافقون - ۹) -

——— " اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار بنو اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ (تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی) زد تمہارے اپنے اُوپر یا تمہارے والدین اور قریب ترین رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو - صاحب معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے - لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو - اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے" (النساء - ۱۳۵) -

——— " اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو - اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو - انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے" (المائدہ - ۸) -

——— " جو لوگ تم سے لڑتے ہیں اُن سے اللہ کی راہ میں لڑو اور حد سے نہ گزر جاؤ - اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" (البقرہ - ۱۹۰) -

——— " اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور راست اور درست بات کیا کرو" (الاحزاب ۷۰) -

——— " جو کوئی تم پر زیادتی کرے اُس پر اُتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بُرائی سے بچنے والوں کے ساتھ ہے" (البقرہ - ۱۹۴) -

——— " اگر تم بدلہ لو تو بس اُسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو - لیکن اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں ہی کے لیے بہتر ہے" (النحل - ۱۲۶) -

——— " تم اہل کتاب اور مشرکین سے بڑی اذیت ناک باتیں سنو گے - (ان اشتعال انگیز باتوں پر) اگر تم صبر کرو اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے" (آل عمران ۱۸۶) -

——— " اللہ بد گوئی پر زبان کھولنے کو پسند نہیں کرتا اِلّا یہ کہ جس پر ظلم کیا گیا ہو" (النساء - ۱۴۸) یعنی

مظلوم کو ظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق ہے۔

——— "نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں جو اللہ کے عہد کو وفا کرتے ہیں اور معاہدے توڑتے نہیں ہیں، جو اُن روابط کو جوڑتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے اور اِس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں اُن سے سخت حساب نہ لیا جائے، جو اپنے رب کی خوشنودی کی خاطر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ بھی رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، اور بدی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں" (الرعد ۱۹ تا ۲۲)۔

——— "اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے حوالے کرو[1]، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو" (النساء ۵۸)۔

——— "اگر تم میں سے کوئی شخص کسی پر اعتماد کر کے کوئی امانت اس کے حوالہ کرے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ اپنے رب سے ڈرے" (البقرہ - ۲۸۳)۔

——— "تم نیکی کا مرتبہ نہیں پا سکتے جب تک وہ چیزیں (راہِ خدا میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے، اللہ کو اس کا علم ہے" (آل عمران - ۹۲)۔

——— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ (راہ خدا میں) خرچ کرو اور بُری سے بُری چیز چھانٹ کر نہ دو، حالانکہ تم خود اُسے کبھی نہ لو گے اِلّا یہ کہ اغماض برت جاؤ۔ اللہ (تمہارے ایسے خرچ سے) بے نیاز اور ستودہ صفات ہے" (البقرہ - ۲۶۷)۔

——— "اگر علانیہ صدقات دو تو یہ بھی اچھا ہے، اور اگر ان کو مخفی رکھو اور غریب لوگوں کو دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی بُرائیاں (اس طرزِ عمل سے) محو ہو جاتی ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے" (البقرہ - ۲۷۱)۔

---

[1] اِس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ذمہ داری کے مناصب (POSITIONS OF TRUST) ایسے لوگوں کے حوالہ کرو جو بارِ امانت اٹھانے کے اہل ہوں۔ مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے نااہل، بددیانت، کم ظرف و بدعمل لوگوں کو نہ دو، کیونکہ بُرے لوگوں کی قیادت پوری قوم کو خراب کر دیتی ہے۔

——— (صدقات خاص طور پر) "اُن فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں ایسے گھر گئے ہیں کہ زمین میں (اپنی کسب معاش کے لیے) دوڑ دھوپ نہیں کرسکتے۔ اُن کی خود داری کی وجہ سے ناواقف آدمی اُن کو خوشحال سمجھتا ہے، مگر تم اُن کے بشرے سے اُن کی حالت جان سکتے ہو۔ وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ نہیں مانگتے۔ (ایسے لوگوں پر) تم جو مال بھی خرچ کروگے اللہ کو اس کا علم ہے" (البقرہ۔ ۲۷۳)۔

——— (جہنم کی آگ سے) "وہ نہایت پرہیزگار آدمی دور رکھا جائے گا جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔ اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اُسے چکانا ہو۔ وہ تو صرف اپنے ربِّ برتر کی خاطر یہ کام کرتا ہے" (اللیل ۱۷ تا ۲۰)۔

——— "اور خرچ کرو اُس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے اور وہ کہے کہ میرے رب، کاش تو مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیتا کہ میں صدقہ دیتا اور صالحوں میں سے ہو جاتا" (المنافقون ۱۰)۔ یعنی صدقہ ایسی حالت میں کرو جب کہ تم صحیح و تندرست ہو، اِس کا انتظار نہ کرو کہ مرنے کا وقت آئے گا تو صدقہ کر دیں گے۔

——— "اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا بُرائی (کرنے والوں) کو معاف کر دو تو اللہ (کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ) بڑا معاف کرنے والا ہے (حالانکہ سزا دینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے" (النساء ۱۴۹)۔

——— "آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو" (البقرہ۔ ۲۳۷)۔

——— "قرض دار تنگ دست ہو تو اس کا ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو، اور اگر صدقہ کر دو (یعنی قرض معاف کر دو) تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو" (البقرہ۔ ۲۸۰)۔

——— "یتیموں کے مال اُن کو دو اور اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو اور نہ اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے" (النساء۔ ۲)۔

——— "یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان کے اندر (اپنے معاملات خود سنبھال لینے کی) اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ فضول خرچی کر کے جلدی جلدی ان کا مال اس اندیشے سے کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنا حق مانگیں گے۔ جو شخص مالدار ہو وہ (ان کی جائداد کے انتظام کا معاوضہ لینے میں) پرہیز سے کام لے، اور جو نادار ہو وہ معروف طریقے سے کھائے (یعنی جسے ہر انصاف پسند آدمی معقول معاوضہ قرار دے)۔ پھر جب اُن کے مال انھیں واپس دو تو ان پر گواہ

بنالو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے" (النساء - ۶)۔

——— (اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے) "اُن یتیم لڑکیوں کے حق میں جن کے واجبی حق تم ادا نہیں کرتے اور اُن کے نکاح کرنے سے باز رہتے ہو، اور ان بچوں کے حق میں جو اپنا کوئی زور نہیں رکھتے، اور ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو" (النساء ۱۲۷)۔

——— "جو لوگ نکاح کا موقع نہ پاتے ہوں وہ عِفّت مآبی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے" (النور - ۳۳)۔ یعنی مجرد لوگ ناجائز طریقوں سے خواہشاتِ نفس پوری نہ کریں۔

——— "اے نبی، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں (غیر عورتوں کی دید سے) بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی (عریانی و بدکاری سے) حفاظت کریں...... اور مومن عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں بچائیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کا، بجز اُس کے جو خود ظاہر ہو جائے، اظہار نہ کریں اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور اپنی زینت نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے (جن کی تفصیل سورۂ نور کی اِس آیت میں دی گئی ہے)، اور اپنے پاؤں زمین پر اس طرح مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا کر رکھی ہے اس کا علم لوگوں کو ہو جائے" (النور ۳۰ - ۳۱)۔

——— "اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو دبی زبان سے اِس طرح بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر بیٹھو اور پچھلے دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو" (الاحزاب ۳۲ - ۳۳)۔

——— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، حرام نہ کر لو اُن پاک چیزوں کو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ نے جو حلال اور پاک رزق تمہیں دیا ہے اسے کھاؤ، اور اس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو" (المائدہ ۸۷ - ۸۸)۔

——— "اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تمہاری آزمائش کر رہے ہیں" (الانبیاء ۳۵)۔ یعنی اِس بات کی آزمائش کر رہے ہیں کہ اچھے حالات میں تم متکبر، ظالم، خدا فراموش اور بندۂ نفس تو نہیں بن جاتے، اور بُرے حالات میں پست اور ذلیل اور ناجائز طریقے تو اختیار نہیں کرنے لگتے۔ یہ ایک کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ اچھے حالات آئیں تو فرعون بن جائے اور بُرے حالات آئیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے یا اُن کو بدلنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنے پر اُتر آئے۔ مومن کا کام ہر حال میں راست روی پر قائم رہنا ہے۔

—— "مومن مرد اور مومن عورتیں سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں" (التوبہ ۷۱)۔

—— "جو عزت چاہتا ہو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) عزت ساری کی ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ہاں جو چیز اُوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے اور عملِ صالح اس کو اُوپر چڑھاتا ہے" (فاطر-۱۰)۔

صالح افراد ہی نہیں، صالح معاشرہ بھی مطلوب ہے

ان فضائلِ اخلاق کے ساتھ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا کہ اسلام کا مقصود صرف صالح افراد تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اُنہیں جوڑ کر ایک صالح معاشرہ بنانا بھی ہے کیونکہ اس کے بغیر نوعِ انسانی کا خُسران سے بچنا اور فلاح پانا ممکن نہیں ہے۔ اس مضمون کو اگرچہ بہت سی جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے، مگر ہم صرف دو مقامات کو بطور مثال لیتے ہیں۔

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ. فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ. وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ. فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ
(البلد ۸ تا ۱۷)

کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور (بھلائی اور بُرائی کے) دونوں نمایاں راستے نہیں دکھا دیے؟ مگر اُس نے دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہ کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا، یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم کو یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر یہ کہ آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایک دوسرے کو صبر اور رحمدلی کی تلقین کریں۔

اس میں غلام کو آزاد کرانا، یا قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا انفرادی نیکیاں ہیں جنہیں اُن بے شمار انفرادی نیکیوں میں سے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے جو افراد میں ہونی چاہییں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ایسے نیک افراد اُن لوگوں میں شامل ہوں جو ایمان لانے والے اور ایک دوسرے کو صبر اور خلقِ خدا پر رحم کھانے کی تلقین کرنے والے ہوں، تاکہ ان سے ایک صابر اور رحیم معاشرہ وجود

میں آئے، یعنی ایسا معاشرہ جو پاکیزہ اخلاق پر ثابت قدم ہو، بُرائیوں اور بُرائی کی ترغیبات سے اپنے آپ کو روکے، راہِ حق کی مشکلات اور مزاحمتوں کا پامردی سے مقابلہ کرے، راستی پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے، اور خلقِ خدا کے لیے ظالم وجابر اور سنگدل نہ ہو بلکہ رحیم وشفیق ہو۔ ایسا معاشرہ خدا اور آخرت پر ایمان اور رسول اور اس کے لائے ہوئے قانون پر غیر متزلزل یقین واعتماد کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اس لیے لامحالہ یہ خوبیاں ایک مومن معاشرے ہی میں ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوسکتی ہیں جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والی کسی آزمائش میں بھی اپنی خوبیوں سے منحرف نہ ہوسکیں۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ	زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے
خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا	ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، اور ایک
بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ	دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

(العصر)

زمانے سے مراد گزرا ہوا زمانہ (یعنی تاریخ) بھی ہے اور گزرتا ہوا زمانہ بھی جو ہر آن گزر رہا ہے۔ اُس کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُس حقیقت پر گواہ ہے جو آگے بیان کی جارہی ہے۔

انسان کا لفظ "مطلقاً" استعمال ہوا ہے، اس لیے اس سے مراد ایک ایک انسان بھی ہے، انسانوں کا ہر مجموعہ بھی، اور پوری نوعِ انسانی بھی۔

خسارے کا لفظ گھاٹے اور نقصان اور ناکامی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جو فلاح، نفع اور کامیابی کی ضد ہے۔

قسم کھا کر قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ جو تاریخ گزر چکی ہے، اور جو حال اب گزر رہا ہے، دونوں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسان بحیثیتِ شخص، بحیثیتِ قوم اور بحیثیتِ نوع، فلاح نہیں بلکہ خسارے میں مبتلا ہے، اور اِس خسارے سے صرف وہی لوگ محفوظ ہیں اور رہے ہیں جن میں یہ چار صفتیں پائی گئی ہیں اور پائی جاتی ہیں:

ایک، ایمان، یعنی اس بات پر پورا یقین کہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی خالق، مالک، رازق، حاجت روا، معبود اور حاکم ہے جس کی بندگی واطاعت اور پرستش کرنی چاہیے، اور اللہ کے رسول کی

لائی ہوئی ہدایت ہی برحق ہے جس کی پیروی کرنی چاہیے ، اور زندگی صرف یہی دنیا کی عارضی زندگی نہیں ہے بلکہ اِس کے بعد ایک دوسری مستقل اور پائیدار زندگی بھی آنے والی ہے جس میں ہم کو اپنے اُن اعمال کا حساب دینا ہے جو ہم نے دنیا میں کیے ہیں اور اُن کی جزا یا سزا پانی ہے۔ یہ ایمان فلاح پانے اور خسارے سے بچنے کے لیے شرطِ اوّل ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو سیرت واخلاق اور کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہو اور جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہوسکتی ہو۔ اس کے بغیر انسانی زندگی خواہ بظاہر کتنی ہی خوشنما ہو، اُس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو اغراض اور خواہشات اور تخیّلات کی موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

دوسرے، اعمالِ صالحہ، جن کا تعلق ایمان کے ساتھ بیج اور درخت کا سا ہے۔ ایمان وہ بیج ہے جس کے بغیر اعمالِ صالحہ کا درخت پیدا نہیں ہوسکتا، خواہ بعض لوگوں کی زندگیوں میں ایمان کے بغیر کچھ ظاہری اور ناپائیدار خوبیاں اور نیکیاں پائی جاتی ہوں۔ اور درخت وہ اعمالِ صالحہ ہیں جن کا اُس انسان کی زندگی میں رونما ہونا اور نشوونما پانا عقل اور منطق کا لازمی تقاضا ہے جس کے دل میں ایمان کا بیج بویا جاچکا ہو۔ اگر کہیں یہ بیج بویا گیا ہو اور اس سے اعمالِ صالحہ کا درخت پیدا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا دل اِس بیج کی قبر بن گیا ہے، اور خسارے سے اُس کے بچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، کیونکہ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ خسارے سے بچنے کی دوسری لازمی شرط ہیں۔

مذکورۂ بالا دونوں صفتیں انفرادی حیثیت سے افراد میں بھی پائی جاسکتی ہیں، اور وہ صرف انفرادی فلاح کی ضامن ہوسکتی ہیں۔ مگر اجتماعی فلاح اِس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ معاشرے میں بحیثیت مجموعی اِن دو صفتوں کے ساتھ وہ مزید دو صفتیں بھی پائی جائیں جنہیں اِس سورہ میں خسارے سے بچنے کے لیے بطورِ شرط بیان کیا گیا ہے اور وہ ہیں صالح مومنوں کا ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنا۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک صحیح اور سچی اور مطابقِ عدل وانصاف اور مطابقِ حقیقت بات خواہ وہ عقیدہ وخیال سے متعلق ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا یا خود اپنے نفس کا۔ پس حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صالح اہلِ ایمان کا معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اس میں باطل سر اُٹھا رہا ہو اور حقوق پامال کیے جارہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ اُس کا اجتماعی ضمیر

ایسا زندہ ہو، اور اس کے افراد اس بات کو اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتے ہوں کہ جہاں بھی باطل سر اٹھائے یا کوئی حق پامال ہوتا نظر آئے، وہاں باطل کی مخالفت اور حق کی حمایت کرنے کے لیے لوگ اٹھ کھڑے ہوں۔ کوئی شخص صرف خود ہی حق پرست اور راستباز اور عادل و منصف اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ دوسروں کو بھی اسی طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہی وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ اس روح سے خالی ہو تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا، بلکہ اجتماعی بگاڑ بڑھتا رہے تو افراد کا بھی حق پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے:

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے یا رُکنے اور باز رہنے کے ہیں۔ اور عربی زبان کے استعمالات میں یہ لفظ تحمّل، برداشت، ضبط، ثابت قدمی، عزم و ارادے کی مضبوطی، اور ہمت و جرأت کے ساتھ کسی مزاحم طاقت کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اس لفظ کو اتنے وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی بن جاتی ہے۔ اپنے جذبات و میلانات اور خواہشات و رجحانات کو حدود اللہ کا پابند بنانا۔ خدا کی نافرمانی میں خواہ کیسے ہی فائدے اور کیسی ہی لذتیں حاصل ہونے کے مواقع نظر آتے ہوں، ان کے لالچ میں مبتلا ہو کر پھسل نہ جانا۔ خدا کی فرماں برداری میں جو نقصانات، تکلیفیں اور محرومیاں پیش آئیں انہیں برداشت کرتے جانا۔ عمر بھر ضبطِ نفس سے کام لے کر گناہ کی جانب شیطان کی ہر ترغیب اور نفس کی ہر خواہش کو رد کرتے رہنا۔ ہر طمع اور خوف کے مقابلے میں حق پرستی پر قائم رہنا۔ ہر اُس اذیت اور نقصان کو گوارا کر لینا جو اس دنیا میں راستبازی اختیار کرنے سے پہنچے، اور ہر اُس فائدے اور لذت کو ٹھکرا دینا جو ناجائز طریقے اختیار کرنے سے حاصل ہو۔ حرام خوروں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر رشک و تمنا کے جذبات سے بے چین ہونا تو درکنار، ان کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھنا اور ٹھنڈے دل سے یہ سمجھ لینا کہ ایک ایماندار آدمی کے لیے اُس چمکدار گندگی سے وہ بے رونق طہارت ہی بہتر ہے جو اللہ اپنے فضل سے اُس کو بخشے۔ ایمان لانے کے سارے خطرات کو اپنی جان پر جھیل جانا۔ دشمنانِ حق کے ہر ظلم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ مخالفتوں کے طوفان اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں حق کی حمایت پر جمے رہنا اور باطل کے آگے دبنے یا اس سے مصالحت کر لینے کا خیال تک دل میں نہ لانا۔ مخالفین کی زیادتیوں اور ان کے طعن و استہزا اور کذب و افترا پر بے ساختہ جھنجھلا نہ جانا بلکہ سکون کے ساتھ اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے تبلیغ و اصلاح کا کام حکمت کے ساتھ کرتے رہنا خواہ اس کے نتیجہ خیز ہونے کے امکانات بظاہر دور دور تک کہیں نظر نہ آتے ہوں۔ اشتعال انگیزیوں پر بے صبر ہو کر جلد بازی میں کوئی ایسا غلط

کام نہ کرنا جو دعوتِ حق کی مصلحت کے خلاف اور مقصدِ دعوت کے لیے نقصان دہ ہو، سالہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر جدوجہد کرتے رہنا جو اخلاق کی ساری حدیں پھاند جاتے ہوں اور طاقت واقتدار کے نشے میں بدمست ہو رہے ہوں، مگر کسی حال میں راستی سے ہٹ کر اُن کی سی ناروا تدبیریں اختیار کرنے پر نہ اُتر آنا۔ باطل کے مقابلے میں حق کی کمزوری اور اقامتِ حق کی سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں اور ائمۂ باطل کی سرفرازیاں اور کامیابیاں دیکھ کر مایوس و دل شکستہ نہ ہونا۔ کبھی گھبراہٹ اور بے حوصلگی اور بدحواسی میں مبتلا ہو کر یہ نہ سمجھنا کہ اقامتِ حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب یہی مناسب ہے کہ اُس ذرا سی دینداری پر قناعت کرکے بیٹھ رہا جائے جس کی گنجائش کفر و فسق کی سلطانی میں مل رہی ہو۔ بد سے بدتر حالات میں بھی عزم و ہمت کے ساتھ حق کی سربلندی کے لیے کوشش جاری رکھنا۔ ایک مومنِ صابر یہ سب کچھ اس لیے نہیں کرتا کہ اِس کے ثمرات و نتائج اِسی دنیا میں اُسے حاصل ہوں گے بلکہ اِس اعتماد پر کرتا ہے کہ مرنے کے بعد جو دوسری زندگی آنے والی ہے اُس میں وہ اپنے اِس کیے کا پھل پائے گا۔ پھر وہ ایسا چھچھورا بھی نہیں ہوتا کہ اچھا وقت آئے اور دنیا میں کامیابیاں اس کے قدم چومیں تو اکڑ جائے اور فخر و غرور میں مبتلا ہو کر فرعون بن جائے، اور بُرا وقت آئے تو بلبلا اُٹھے اور اُس وقت کو ٹالنے کے لیے کوئی ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے میں بھی تامّل نہ کرے۔ وہ ہر حالت میں اپنا توازن برقرار رکھتا ہے۔ وقت کی ہر گردش کے ساتھ اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ ہمیشہ ایک معقول اور صحیح رویہ پر قائم رہتا ہے۔ حالات سازگار ہوں اور وہ دولت واقتدار و ناموری کے آسمانوں پر چڑھ رہا ہو تو اپنی بڑائی کے نشے میں بدمست نہیں ہوتا۔ اور کسی وقت مصائب و مشکلات کی چکی اُسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہرِ انسانیت کو اس میں ضائع نہیں کر دیتا۔ خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی شکل میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، اُس کی بُردباری اپنے حال پر قائم رہتی ہے۔ سورۂ عصر کا منشا یہ ہے کہ انسان خسارے سے صرف اسی صورت میں بچ سکتا ہے کہ افراد فرداً فرداً بھی مومن، صالح، حق پرست اور صابر ہوں، اور ان سے ایک ایسا معاشرہ بھی وجود میں آئے جس میں ہر فرد دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرے۔

یہ اخلاق کا ہتھیار وہ زبردست ہتھیار تھا جس کا کوئی توڑ مشرکینِ قریش اور کفارِ عرب کے پاس نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف خواہ کیسی ہی الزام تراشیاں وہ کرتے، کوئی معقول آدمی یہ باور نہ کرسکتا تھا کہ ایسی اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیم کوئی خود غرض، یا مجنون، یا ساحر یا کاہن دے سکتا ہے۔

(باقی)

تحریک اور معاشرہ

سید اسعد گیلانی

ہر تحریک انسانی معاشرے میں کسی نہ کسی اصلاح کی داعی ہوتی ہے اور ہر اصلاح ایک تغیر کی طالب ہوتی ہے۔ اس طرح درحقیقت ہر تحریک اپنے گرد پھیلے ہوئے انسانی معاشرے میں کسی نہ کسی نوعیت کا کوئی تغیر ہی برپا کرنے کی دعوت لے کر اٹھتی ہے اور اس کا مطلوبہ تغیر یا انقلاب، تحریک کی دعوت اور پروگرام کی روشنی میں اس پر ایک نظرِ غائر ڈالنے والے ہر شخص پر واضح ہوجاتا ہے۔ ایک اسلامی تحریک ظاہر ہے کہ اسلامی انقلاب کی داعی ہوتی ہے اور ایک اسلامی انقلاب کی منہاج گزشتہ دور کی تمام اسلامی تحریکوں کی جدوجہد میں بہت آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ دورِ حاضر کے داعئ تحریک اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ہر دور میں اٹھنے والی اسلامی تحریک کے مطلوبہ انقلاب کی اصولی اور نظریاتی منہاج کو اپنی ایک تقریر "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" میں نہایت جذبہ انگیز انداز میں بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حقیقتاً وہ اصولی طریقِ کار دنیا کے ہر معاشرے، تاریخ کے ہر دور، اور دنیا کے ہر ملک میں آزمایا جاسکتا ہے اور اپنے زیادہ سے زیادہ مظاہر اور خدوخال کے ساتھ ہر جگہ اپنایا جاسکتا ہے۔ لیکن دورِ حاضر کی جمہوری دنیا میں انھوں نے جو طریقِ کار "اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں تجویز کیا ہے وہ اسلامی انقلاب کے اصولی اور جمہوری طریقِ کار کے پس منظر میں تجدیدِ نظریہ کا بہترین نمونہ ہے۔ جو شخص ان دونوں تقاریر کو یکجا کرکے پڑھے گا وہ دورِ حاضر کی اسلامی تحریک کے اس داعی کی تخلیقی اور اجتہادی بصیرت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہے گا اور اسے معلوم ہوجائے گا کہ ایک ملوکیت زدہ پس ماندہ معاشرتی دور کے بعد دورِ حاضر کے جدید جمہوری معاشرے میں اسلامی تحریک اٹھانے کی کیا تدبیر اور اس کے لیے کیا مناسب طریقِ کار ہوسکتا ہے۔

دعوت اور معاشرے کا ردِعمل کسی تحریک کے پھلنے پھولنے اور نشوونما پانے کی رفتار میں کمی بیشی کے

خارجی اسباب میں معاشرے کا ردِّ عمل سب سے بڑا عامل ہے۔ معاشرے کی حیثیت زمین کی سی ہوتی ہے۔ زمین زرخیز ہو تو بیج جلد نشوونما پاتا ہے۔ کمزور ہو تو فصل کمزور ہوتی ہے اور زمین بنجر اور شوریائی ہو تو اچھا بیج بھی نشوونما نہیں پا سکتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر دعوت ایک ایسی پُرزور حرکت ہوتی ہے جس کے نتائج لازماً برآمد ہوتے ہیں — اسے موافق لوگ بھی میسر آتے ہیں، مخالف بھی ملتے ہیں اور غیر متعلق، بے حس اور بے نیاز لوگوں سے بھی اسے واسطہ پڑتا ہے۔ قرآن نے انبیاء کی دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی جو اخلاقی تصویر سورۂ بقرہ میں پیش کی ہے اس تصویر کے ذریعے (اس آئینے میں دورِ حاضر کی ملّتِ مُسلمہ بھی اپنا رُخِ کردار دیکھ سکتی ہے) کتابِ الٰہی کو قیامت تک آنے والی انسانیت کے حوالے کرتے ہوئے سُورت کے آغاز میں ہی دعوت کے مقابلے میں نمودار ہونے والے تین انسانی گروہوں کا تعارف کرا دیا گیا ہے۔ اس طرح انسانی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی تحریک کے مقابلے میں ایک معاشرے کا جو نفسیاتی اور اصولی ردِّ عمل ہو سکتا ہے وہ واضح طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں کافر معاشرے میں اُٹھنے والی دعوت کے ردِّ عمل کا نقشہ کچھ اس طرح ہے کہ پہلا گروہ دعوت کی حقانیت کو تسلیم کر لینے والوں کا سامنے آتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔	(ہدایت ہے) ان لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (قرآن) اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

(البقرہ - ۵)

اس کے بعد معاشرے کے دوسرے گروہ کا تعارف ہے جو انکار و تردید اور مخالفت کو ہی اپنا مسلک بناتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ	جن لوگوں نے تسلیم کرنے سے انکار ہی کر دیا۔

ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (البقرہ - ۶)

ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔

پھر اس کے بعد ایک تیسرے گروہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (البقرہ - ۸)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لائے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔

قرآن یہ نقشہ ایک نبی کی اسلامی دعوت کے مقابلے میں ایک کافر معاشرے کے ردعمل کا کھینچتا ہے اور دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں ردعمل کے یہ تین نمونے پیش کر کے معاشرے کے تین قسم کے افراد کو الگ الگ کر کے بیان کرتا ہے۔ اب اگر پہلا گروہ کثیر ہو جائے تو بالعموم تیسرا گروہ بھی اپنے مفادات کو اس کے ساتھ وابستہ سمجھ کر مزاحمت نہیں کرتا۔ بس صرف زیادہ سے زیادہ غیر فعال اور غیر مؤثر رہتا ہے۔ لیکن اگر دعوت قبول کرنے والوں کا گروہ قلیل اور غیر مؤثر ہو تو تیسرا گروہ بالعموم کھلم کھلا انکار کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں ایک منظم حکومت اور اصلی یا نام نہاد جمہوریت کے اندر جب تجدیدِ دعوت کے لیے ایک جمہوری تحریک چلائی جائے تو بالعموم دعوت کی تائید کرنے والے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے درمیان معاشرے کی ایک کثیر آبادی غیر جانبدار، غیر متعلق، بے نیاز اور بے حس پڑی رہتی ہے اور وہ ایسے خاموش تماشائیوں کے ہجوم کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو پہلوانوں کا دنگل دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا ہو اور اسے کسی پہلوان سے بھی کوئی دلی لگاؤ نہ ہو، بس جو بھی دنگل میں کامیاب رہے اسی کے گلے میں سب سے پہلے ہار ڈالنے کا ذوق و شوق ہو۔ اسے فریقین کی اچھائی بُرائی، نیکی بدی، حق اور ناحق سے کوئی بحث نہیں ہوتی، نہ اس کو ان چیزوں کا کوئی واضح شعور ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے میں دعوت کے مقابلے میں قرآن کے نشان کردہ وہی تین گروہ اس صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔

۱۔ موافقین ۲۔ مخالفین ۳۔ غیر جانبدار خاموش تماشائی۔

اب تحریک کی نتیجہ خیز کارکردگی اور اس کے نتائج کا تعلق ان گروہوں کے تناسب پر ہوتا ہے۔ جب تک غیر جانبداری کی برف کو پگھلا کر اسے جانبدار نہ بنایا جائے اور اسے تحریک کے دعوتی بہاؤ میں نہ بہایا جائے اُس وقت تک تحریک کے لیے معاشرے میں جذب و نفوذ کے مؤثر مواقع پیدا نہیں ہوتے۔ غیر جانبدار

لوگوں کی کثرت ہوتے چلے جانا تحریک کے غیر مؤثر ہو کر جمود میں مبتلا ہونے کا باعث بن جاتا ہے۔ اس سے تحریک کی قوتِ اِقدام کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس لیے کہ مؤثر پذیرائی نہ ہونے سے دل بتدریج بجھنے لگتے ہیں اور قوتِ کار ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ مخالفینِ دعوت اور غیر جانبداروں کی کثرت کا شکار ہمیں حضرت نوحؑ کی اسلامی دعوت دکھائی دیتی ہے جہاں صدیوں تک دعوتِ اسلامی پیش کرنے کے باوجود نفوذ و پذیرائی کے دروازے دلوں کے پتھر ہو جانے کے سبب بند چلے آتے ہیں۔

کسی تحریک کے لیے یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ کوئی معاشرہ اس سے صرفِ نظر (IGNORE) کرے۔ اسے کوئی اہمیت نہ دے۔ اس کی بات پر کان نہ دھرے، نہ اس کی مؤثر مخالفت کرے جس سے کارکنوں میں چیلنج کا مقابلہ کرنے کی جرأت و شجاعت پیدا ہو، اور نہ اس کا ساتھ دے کہ کارکنوں کے حلقۂ رفاقت میں اضافہ ہو اور تحریک کی طاقت بڑھے۔ معاشرے کی طرف سے بےحسی، بے نیازی، عدم پذیرائی اور سرد مہری بھی عموماً تحریک کے لیے بتدریج جمود کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔ کسی معاشرے میں اگر ایسے افراد کی کثرت ہو جائے جن کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (الاعراف۔ ۱۷۹)	اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال دعوت کے لیے نہایت سنگلاخ زمین بن جاتی ہے اور اس کے نفوذ کا عمل رکا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں تحریک کے اندر مایوسی اور قنوطیت کا پیدا ہونا ایک فطری سی بات ہے اور اس کیفیت کو رفع کرنا اور معاشرے کے ضمیر پر جمی ہوئی اس سنگین تہہ کو توڑ کر اس میں دعوت کا بیج ڈالنا سخت مشکل امر بن جاتا ہے۔

ایسی صورت میں سب سے اہم عمل معاشرے کی دعوت سے بے خبری کو باخبری سے، بے علمی کو علم سے، عدم آگہی کو آگہی سے، اور نا آشنائی کو آشنائی سے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے

کسی کسان کو بنجر اور سنگلاخ زمین آباد کاری کے لیے دے دی جائے۔ ایسی زمین محنت کی زیادہ مقدار طلب کرتی ہے اور جن حالات میں ایک کسان زرخیز زمین میں فصل اُگاتا ہے اُس سے کہیں زیادہ سنگین تر حالات سے دوچار ہو کر ہی سنگلاخ اور بنجر زمین کو آباد کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے معمول کی محنت، معمول کی تدابیر، معمول کے آلات اور معمول کے اوقاتِ کار کافی نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی محنت اوقات اور حکمتِ کار کی ضرورت ہوتی ہے۔

آج کی مسلمان قوم کی یہی ذہنی، اخلاقی اور نفسیاتی کیفیت ہے جس کا تجزیہ دَورِ حاضر کے داعیِ تحریک اسلامی سیّد مودودی نے نہایت خوبی کے ساتھ ایک تقریر میں کیا ہے۔

"جس قوم میں کام کرنے کے لیے ہم اُٹھے ہیں صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اس کے اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اس میں کیرکٹر کی وہ طاقت بہت ہی کم باقی رہ گئی ہے جس کی مضبوط چٹان پر اٹل فیصلے، مستقل ارادے، ثابت عزائم اور بھروسے کے قابل عہد و میثاق قائم ہوتے ہیں۔ اس میں مدت ہائے دراز سے یہ کمزوری پرورش پا رہی ہے کہ ایک چیز کو حق جانیں اور دل سے اسے حق مانیں مگر اس کے لیے کوئی قربانی گوارا نہ کریں، نہ وقت کی، نہ مال کی، نہ خواہشاتِ نفس کی، نہ اپنے مرغوب افکار و نظریات کی، نہ اپنے جاہلیت کے اذواق اور دلچسپیوں کی اور نہ کسی اور چیز کی۔ انھیں وہ حق پرستی تو بہت اپیل کرتی ہے جس میں حق کو زبان سے حق کہنا اور اس پر لفظی عقیدت کے پھول نچھاور کرنا اور اس کے لیے چند نمائشی کام کر دینا کافی ہو اور اس کے بعد انھیں اُس حق کے خلاف ہر طرح اپنے کاروبار اپنے ادارے اور اپنی زندگی کے سارے معاملات چلانے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اسی لیے وہ نام نہاد مذہبیت کے اُن راستوں کی طرف خوشی خوشی لپک جاتے ہیں جن کی دینداری اور سعی و عمل کا سارا مدار اسلام اور جاہلیت کی مصالحت (COMPROMISE) پر ہے لیکن ایسی حق پرستی اُن کے لیے ایک ناقابلِ تحمّل بارِگراں ہے جو کفر و اسلام، حق و باطل اور اطاعت و بغاوت کے درمیان دو ٹوک فیصلہ چاہتی ہو، اور جس میں ہر اُس شخص سے جو حق کو ماننے کا اقرار کرے۔ پہلا مطالبہ یہ

ہو کہ وہ یکسو ہو جائے، اور پھر مزید مطالبہ یہ ہو کہ جس چیز کو حق مانا ہے اس کے لیے اپنی پوری شخصیت کو تج دے اور عمر بھر کے لیے تج دے، اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانیاں گوارا کرے، اور ایک دو دن کے لیے نہیں بلکہ جب تک جیتا ہے اس وقت تک گوارا کرتا رہے۔ ایسے گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے بہت سے مسلمان مل جائیں گے جو اسلام کے لیے خوشی خوشی سینے پر گولیاں کھا لیں گے، سروں پر لاٹھیوں کی بارش سہ لیں گے۔ یہ سب کام اُن کے لیے ہلکے ہیں۔ لیکن اپنی پوری زندگی کو اسلام کے ضابطے میں کس دینا اور صبر کے ساتھ اس کی اخلاقی ذمہ داریوں کو قبول کر کے نبھانا، یہ ان کے لیے بہت بھاری بوجھ ہے جس کی سہار اُن کے لیے سخت دشوار ہے۔"[1]

غرض ایک فعّال تحریک کا کام یہ ہے کہ وہ یکسو اور باعمل لوگ تیار کرتی چلی جائے اور غیر جانبدار لوگوں کے انبوہ کثیر کو کم کر کے اپنی تعداد میں اضافہ کرتی رہے۔ اسی طرح معاشرے میں اسلامی عمل تدریجاً آگے بڑھ سکتا ہے۔

تحریک کی ایک ناگزیر ضرورت، معاشرے کی علاقائی قیادت | جمہوری معاشرے میں انقلاب کی داغ بیل ڈالنے کے لیے عملی میدان میں سب سے پہلی اور ابتدائی ضرورت معاشرے کے مختلف طبقات اور مختلف گوشوں میں اُس ذیلی قیادت کی تشکیل ہوتی ہے جس کے بغیر معاشرے کو چاروں سمتوں میں اُٹھایا، سنبھالا اور مطلوبہ رُخ پہ چلایا نہیں جا سکتا۔ اسی لیے موجودہ دور میں اُٹھنے والی اسلامی تحریک کے داعی نے آغازِ دعوت پہ ہی عوام میں نفوذ کے لیے ہر سطح پہ سب سے پہلے اسی نظریاتی اور جمہوری قیادت کی تشکیل کی ضرورت پہ زور دیا تھا۔

"ہمیں عوام میں عمومی تحریک (MASS MOVEMENT) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرنی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور ایسی اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیرِ افکار کے ساتھ

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ دوم صفحہ ۱۷-۱۸

اجتماعی قیادت کے دوسرے فرائض کو بھی سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک
کو پھیلا دینے کے لیے جلدی نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت
یہ ہے کہ ملک کے اہل دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین افراد
کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بن سکیں۔"[1]

یعنی داعیٔ تحریک کے نزدیک دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کی جمہوری اسکیم یہ تھی کہ معاشرے میں سے چھانٹ کر بااصول باکردار اور بالبصیرت قائدانہ صلاحیت رکھنے والی ایک ایسی ٹیم تیار کی جائے جو اسلامی انقلاب کی جانگسل کشمکش میں جان کی بازی کھیل سکے اور عوام کو اپنے ساتھ لے کر چل سکے۔ چنانچہ آگے چل کر انہوں نے فرمایا:

"ہمارے پیش نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک ایسی مختصر
جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیرکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک
علاقہ کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور کسی مصنوعی کوشش
کے بغیر بالکل فطری طریقے سے عوام کی لیڈر شپ کا منصب اسے حاصل ہو جائے۔ مگر
صرف مرجعیت سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ اس سے کام لینے کے لیے دماغی صلاحیتیں
بھی ہونی چاہییں تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم
ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔"[2]

غرض تحریک میں زندگی، روانی، وسعت، گہرائی اور اثر پذیری پیدا کرنے کے لیے ایک موثر اور جاندار ٹیم اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر تحریک مؤثر طور پر اپنا کردار ادا نہیں کر سکتی، اور نظریہ کردار میں ڈھل کر ہی عوام کو متاثر کر سکتا ہے۔ ایک تحریک اگر اپنے فطری نتائج دکھانے میں کوتاہ نظر آئے تو دوسرے عوامل کے ساتھ اس اہم سبب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسے انقلاب کی قیادت کرنے کے لیے کیسی ٹیم میسر آئی ہے۔ داعیٔ تحریک اور اس کے قریبی رفقاء کی مثال کھیل کے میدانِ عمل میں کیپٹن اور ٹیم کی ہوتی ہے۔ ٹیم کی تعداد کافی نہ ہو یا کافی تو ہو لیکن باصلاحیت موثر اور جاندار نہ ہو تو کیپٹن کی کارکردگی

---

[1] روداد حصہ اول صفحہ ۹۱-۹۲۔

[2] روداد جماعت اسلامی حصہ اول صفحہ ۹۱-۹۲۔

کوئی نتیجہ پیدا کرنے سے معذور رہتی ہے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت صالحؑ اور ان کے دور کی اسلامی تحریکیں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ وہ تحریکیں بھی نتائج نہ پیدا کرسکیں جن کو نبیوں کی قیادت میسر تھی اس لیے کہ انھیں حضورؐ اکرم کی طرح ایک مؤثر، جاندار اور جانباز ٹیم میسر نہ آئی۔ کسی داعیِ تحریک کے لیے ٹیم کا مسئلہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔ یہ تحریک کی کارکردگی اور نتائج کار میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک نظریاتی تحریک کو اُس ٹیم کی بہت ضرورت ہوتی ہے جو معاشرے کے مختلف طبقات اور ملک کے مختلف گوشوں میں موجود ہو اور تحریک کی ذیلی اور عوامی قیادت کا کام کرے۔ معاشرے کے عوام میں ایک ذیلی قیادت تو ہمیشہ موجود ہوتی ہے جو ہر نئے نظام کے پاؤں بن کر اُس کا وزن اُٹھاتی اور اس کی جڑیں عوام میں لگاتی ہے۔ یہ ذیلی اور علاقائی قیادت ہر معاشرے کا مستقل اور لازمی حصہ ہوتی ہے۔ قبائل کی سرداریاں، علاقوں کی چودھراہٹیں اور برادریوں کی سربراہ کاریاں اسی ذیلی اور علاقائی قیادت کے مختلف رُوپ ہیں، اور یہی ذیلی قیادت ہر تحریک کو معمولی ردوبدل کے ساتھ کام دیا کرتی ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کچھ لوگ کام نہ دیں تو عوامی دباؤ پڑنے سے کام نہ دینے والی ذیلی قیادت خود بخود بدل جایا کرتی ہے اور نئے تقاضوں کا ساتھ دینے لگتی ہے۔

اسلامی تحریک کے لیے اس ذیلی قیادت میں تین صفات کا ہونا لازمی ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو دورِ حاضر کی اسلامی تحریک کے داعی نے تحریک اُٹھاتے وقت اپنی مختلف ابتدائی تقاریر میں جابجا بیان کی ہیں۔

۱۔ وہ اپنے پورے علاقے میں سیرت و کردار میں ممتاز و ممیز، اور ہر مجلس میں مطلوب و معروف اور نمایاں ہو۔

۲۔ وہ اپنی خدمتِ خلق، سماجی خدمات اور عوامی مسائل و مشکلات میں حصہ لینے میں سب سے آگے آگے ہو۔

۳۔ وہ اپنے جوش و جذبہ، مضبوط کردار، شجاعت و بہادری کے ساتھ نڈر، بے خوف اور دبنگ ہو۔

اس طرح اس قیادت کا ہر فرد باطل کی بنائی ہوئی شخصیتوں سے کشمکش کرکے اپنی شخصیت کا لوہا منوائے۔ وہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ وہ کسی طاقت سے نہ دبے۔ وہ کسی قیمت پر نہ بکے۔ وہ سیرت و کردار میں ممتاز، خدمتِ خلق میں سرگرم، لوگوں کے مسائل میں عوامی ترجمان اور اپنے علاقے میں شجاعت و بہادری کا اعلیٰ نمونہ ہو۔ ایسے افراد ہر انتخابی حلقے، ہر ضلع اور ہر برادری اور ہر قبیلے میں تیار ہو جائیں جو اسلامی انقلاب

کے لیے اپنی دیانت و امانت اور اخلاق و سیرت اور زوردار شخصیت کا لوہا منوائیں - جس کے نتیجے میں چند سال کے اندر اندر لوگ ان کے کردار کی مضبوطی اور بلندی کے سبب ان پر اعتماد کرنے لگیں - اُن کی خدمتِ خلق کے سبب اُن سے محبت کریں - اور ان کی بہادری کے سبب ان پر بھروسا کریں اور بدکار اور غنڈے ان سے خوف کھائیں - ایسے افراد جب کسی تحریک کی دعوت کے ساتھ عوام کے مسائل لے کر کسی علاقے میں اُٹھیں گے تو عوام ان کے ساتھ اُٹھیں گے اور جب وہ کوئی رُخ اختیار کریں گے تو عوام کا رُخ بھی اسی سمت ہو جائے گا - یہی وہ علاقائی ذیلی قیادت ہے جو ایک اصولی تحریک کو عوامی تحریک بنا سکتی ہے اور ایک محدود تحریک کو عوام کے لا تعداد سیلاب کے اُبھار کی رہنما بنا کر کھڑا کر سکتی ہے -

تحریک اور عوام میں نافہمی کا پردہ | ہر قوم اور معاشرے کو اسی کی زبان میں مخاطب کرنے میں یہی حکمت ہے کہ عوام دعوت کی بات سمجھیں - اس کے دلائل سے آگاہ ہوں - تحریک کے ساتھ شمولیت کے فوائد اور اس سے دُور رہنے کے نقصانات سے واقف ہوں ، اور وہ اپنی بولی ، اپنے انداز اور اپنے فہم کے مطابق اُٹھنے والی تحریک کے خدوخال سے آگاہی حاصل کر کے اس کا ساتھ دیں ، تاکہ وہ اپنی رضامندی سے تحریک کی دعوت کا جھنڈا اُٹھائیں اور اس کے ساتھ شامل ہو کر تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچائیں اور خود بھی تحریک کے ساتھ اس منزل تک پہنچیں جس پر پہنچنے سے ہی انہیں فلاح نصیب ہو سکتی ہے -

جس گروہ کو یہ شعور حاصل ہو جائے کہ اس کی فلاح کسی خاص طرزِ عمل میں ہے اُس کا اپنی فلاح کی خاطر وہ طرزِ عمل اختیار کرنا بالکل ایک فطری امر ہے - اس طرح فہم و شعور کے حصول کے بعد تحریک اور عوام کے درمیان پڑا ہوا عدمِ آگاہی ، ناواقفیت ، شکوک و شبہات اور دُوری کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور وہ تحریک کے ساتھ آ جاتے ہیں - یہ ممکن نہیں ہے کہ انہیں تحریک سے وابستگی میں اپنی فلاح کا شعور بھی حاصل ہو جائے اور وہ پھر بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوں -

لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحریک اور عوام کے درمیان ایک نافہمی کا پردہ حائل رہتا ہے - جس انداز پر تحریک اپنی دعوت پیش کرتی ہے عوام اس سے مانوس نہیں ہوتے - جو لُغت وہ اظہارِ مدعا کے لیے استعمال کرتی ہے عوام اُس لُغت کے مفہوم سے آشنا نہیں ہوتے - جس مقام سے وہ دعوت پیش کرتی ہے اُس سطحِ فہم سے عوام کی سطحِ فہم مختلف ہوتی ہے اور وہ دعوت کو خالی آنکھوں سے دیکھتے اور نا فہم کانوں سے سُنتے ہیں - یہی پردہ ہے جسے تحریک اور عوام کے درمیان "نافہمی کا پردہ" (COMMUNICATION GAP)

کہا جاسکتا ہے، جسے دُور کیے بغیر انہیں تحریک کے قریب نہیں لایا جاسکتا۔ یہ پردہ اُس تحریک کے کارکنوں کی زبانوں پر اپنے مخصوص مفہوم کی حامل اصطلاحات کا بھی ہوسکتا ہے، اندازِ بیان اور طرزِ ادا کا بھی ہوسکتا ہے، بولی اور لب و لہجہ کا بھی ہوسکتا ہے، لباس تراش خراش اور رہن سہن کا بھی ہوسکتا ہے، شہری اور دیہاتی اور خواندہ اور ناخواندہ کا بھی ہوسکتا ہے، اور خود تحریک اور اس کے مقاصد کے بارے میں مخالفین کی پیدا کردہ غلط فہمیوں، الزام تراشیوں اور بدگمانیوں کا بھی ہوسکتا ہے۔ اس پردے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور ہر صورت تحریک اور عوام کے درمیان حائل ہو کر انہیں باہم قریب ہونے سے روکتی ہے۔

مثلاً تحریک تو عوام کی فلاح کا پروگرام رکھتی ہے، اور عوام سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں مجبور و پابند کردے گی تحریک کی دعوت اُن کے رسوم و رواج کے بندھن توڑ کر انہیں سادہ فطری اور ہلکا پھلکا کرنا چاہتی ہے، اور انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اُنہیں جکڑ بندیوں سے دوچار کردے گی۔ تحریک اُن کی بنیادی ضروریات تک کا اہتمام کرنا چاہتی ہے، اور انہیں گمان ہوتا ہے کہ وہ ان کے بنیادی حقوق بھی چھین لے گی۔ اس طرح اپنائیت کے بجائے منافرت، رفاقت کے بجائے عداوت، الفت کے بجائے کدورت اور اُنسیت کے بجائے اجنبیت باہمی حائل رہتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ تحریک محسوس کرتی ہے کہ پتھروں پر بارش ہو رہی ہے جن سے روئیدگی کی توقع عبث ہے۔ اور تحریک اور عوام دونوں کے درمیان یہ فاصلہ محض اس سبب سے ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان نافہمی کا پردہ حائل ہوتا ہے، تحریک کی باتیں عوام کے لیے ترکی بار کی باتیں بن جاتی ہیں جس کی ترکی سے وہ آشنا نہیں ہوتے۔ یہ نافہمی بالآخر بیزاری چڑچڑاپن اور مایوسی کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور فہم کا حجاب، حجابِ اکبر بن کر رہ جاتا ہے اور تحریک اور معاشرہ دونوں اپنی اپنی جگہ سمٹ اور سکڑ کر رہ جاتے ہیں۔

مورچوں اور محاذوں کی کثرت دعوت دلوں کو مسخر کرنے والی چیز ہوتی ہے اور جب وہ دعوت کسی تحریک کا موضوع ہو تو وہ تحریک ایک زوردار اور طوفانی دریا کی مانند ہوتی ہے جو اپنی قوتِ استدلال، عظیم فلاحی پروگرام، انقلابی تصوّرات و نظریات اور دلنشین اور انوکھے اندازِ بیان سے اپنے اندر دلوں کو مسخر کرنے کا سامان رکھتی ہے۔ معاشرے کا وجود اگرچہ چٹان کی طرح بھاری اور سمندر کی طرح اتھاہ ہوتا ہے۔ لیکن اس بھاری وجود کا جامد اور رسمی طرزِ فکر بالآخر تحریک کے انقلابی فکر کے زور سے متزلزل ہونے لگتا ہے۔ اس لیے کہ تحریک ایک قوت کا نام ہے جو فکری اور عملی دونوں میدانوں میں فعال و سرگرم ہوتی ہے۔ اس میں بہاؤ ہوتا ہے ٹھہراؤ

نہیں ہوتا۔ اسی لیے معاشرے کے مقابلے میں تحریک کی تھوڑی سی قوت بھی بہت تاثیر اور تغیر کی صلاحیت رکھتی ہے اور اگر اس کی قوت مرکوز ہو کر معاشرے کو اپنی رَو میں بہانے کا کام مسلسل اور پر زور طریقے سے کرتی ہے تو وہ کسی پہاڑی نالے کی طرح معاشرے کی بنیادوں تک اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر تحریک کا اصولی نظریاتی اور دعوتی زور مختلف مورچوں پر بٹ جائے تو معاشرے کا بے ہنگم دیو اس تقسیم شدہ قوت کو چھوٹے بڑے حصوں میں تقسیم پا کر اسے علیحدہ علیحدہ اپنے بے شمار بازووں میں سمیٹنے اور سمونے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ جس طرح دریا کو نہروں اور نالیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کے شہ زور دھارے دم توڑ جاتے ہیں اور جو لہریں بڑے بڑے جہازوں کو اٹھا کر پٹخنے کی صلاحیت رکھتی تھیں وہ نہروں اور نالیوں میں پہنچ کر اپنا سارا بہاؤ اور قوت کھو دیتی ہیں، یا جس طرح نیزے کی انی کو، جو شہ زوروں کا جگر چیرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جب بہت سی سوئیوں کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ کوئی معرکہ سر کرنے کے قابل نہیں رہتی، اسی طرح جب کسی معاشرے میں کوئی تحریک چاہے تدبیر کے طور پر ہی سہی، توازن کا کوئی لحاظ رکھے بغیر بے شمار مورچوں پر اپنی قوت تقسیم کر دیتی ہے تو اس کا وہ زوردار بہاؤ بہت کچھ تھم جاتا ہے اور معاشرے کی بے شمار آلائشیں اور جذب و انجذاب کی قوتیں مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں تحریک کے اندر نفوذ کرنے لگتی ہیں جس سے اس کی انقلابی قوت متغیر ہونے لگتی ہے۔

ع دریا کا جتنا زور تھا لہروں میں بٹ گیا

بلاشبہ ہر تحریک معاشرے کے مختلف طبقات کو مخاطب کرنے، سمیٹنے اور متوجہ کرنے کے لیے مختلف پلیٹ فارم بناتی ہے اور ہر محاذ کا ایک مورچہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ کام بڑی حکمت و تدبر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کرنے کا ہوتا ہے اس لیے کہ مختلف محاذوں سے بہت سی چھوٹی چھوٹی قیادتیں ابھرتی ہیں، اور اس میں معاشرے کی بے شمار کمزوریوں اور نفسیاتی بیماریوں کے گھس آنے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ زمین پر فرشتوں کو نہیں انسانوں کو آباد کیا گیا ہے اور اجتماعی کاموں کے لیے انسانوں سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ پھر یہ مختلف مورچوں کی چھوٹی چھوٹی قیادتیں جہاں مطلوب ہیں وہاں تحریک کے اجتماعی مرکز اور فکر سے دور رہ کر کام کرنے کے سبب فکر و عمل کی بہت سی مکانی گمراہیوں میں مبتلا ہونے کے امکان سے بھی ضرور دوچار ہوتی ہیں۔ مثلاً قیادت کا چسکا۔ فوائد سمیٹنے کا طرز فکر۔ تحریک کی ساکھ سے فائدہ اٹھانے کا رجحان۔ خود پسندی کی سوچ۔ غرض دریا نالیوں میں بٹتے بٹتے اگر خود ہی خشک ہو کر رہ جائے تو یہ اس تدبیر کی مہلک غلطی کا ہولناک نتیجہ بھی ہو سکتا ہے جس میں تقسیم کار کرتے ہوئے

احتیاط اور تعینِ اوقات سے کام نہ لیا گیا ہو۔ اِس صورت میں اس تحریک کا یہ انجام ہوتا ہے کہ

؎ اس موج کی قسمت پہ روتی ہے بھنور کی آنکھ دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ظاہر ہے کہ جب فکری وحدت مختلف بولیوں اور مختلف پلیٹ فارموں میں تقسیم ہو جائے اور تحریک کے محدود وسائل ایک پُرزور انقلابی جدوجہد کے بجائے متعدد اور مختلف النوع مورچوں میں بٹ جائیں تو ایسے دریا کی موج کس طرح کسی ساحلِ مراد تک پہنچ سکے گی۔

مورچوں کی کثرت کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ کوئی تحریک دشمن کے مقابلے میں معاشرے کے اندر مختلف محاذوں پہ جنگ چھیڑ دے اور وہ جنگ اتنی وسیع الاطراف اور کثیرالوسائل ہو کہ تحریک اتنے محاذوں پر جنگ لڑنے سے عاجز آ جائے اور اس کا امیج (IMAGE) ایک تعمیری قوت کی بجائے ایک جھگڑالو تخریبی قوت کا سابن کر رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر تحریک کا حریف وہ اقتدارِ وقت ہوتا ہے جو تحریک کے نظریات کے مخالف نظام کا پہریدار اور خدمتگار ہوتا ہے۔ اور چونکہ اس کے ہاتھ میں قوت اور خزانوں کی کنجیاں ہوتی ہیں اس لیے اس کے لیے مقابلہ کرنے میں وسائل کی قلت یا مردانِ کار کی کمی کا اس کے لیے کبھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال صرف تحریک میں ہی پیدا ہوتا ہے جو نظامِ غالب کی تمام نوازشات سے محروم ہو کر اور اس کی تمام قہرمانیوں کا نشانہ بن کر ایک انقلابی جدوجہد کر رہی ہوتی ہے۔ اُسے اپنی قوت کو بڑی احتیاط اور حکمت کے ساتھ اس طرح صرف کرنا ہوتا ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر نظامِ غالب کو کچھ نہ کچھ پیچھے دھکیلا جا سکے۔ اس لیے کسی معاشرے میں ایک تحریک کی حکمتِ عملی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تھوڑی قوت کو سمیٹ کر کسی ایک نقطے پر اس طرح مرکوز کر کے استعمال کرے کہ اُسی قوت کے استعمال کے جمہوری، سیاسی اور معاشرتی نتائج کُھلی آنکھوں سے دیکھے جا سکیں اور عوام اس میں آنے والی کامیابیوں کی جھلک محسوس کر سکیں۔

صاف ظاہر ہے کہ جتنے زیادہ محاذ کُھلیں گے اسی قدر تحریک کی قوت بٹے گی، اور جس قدر اس کی قوت زیادہ بٹے گی معاشرے میں اس کا مؤثر نفوذ اسی قدر کم ہوگا، اور جس قدر اس کا نفوذ کم ہوگا اسی قدر وہ معاشرے کے عملِ انجذاب کا شکار ہوگی۔ اس طرح معاشرہ کا بحر الکاہل تحریک کی اُبھرتی ہوئی سرکش موج کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے پھر اسے واپس اپنے دامنِ غفلت و جمود میں لے جائے گا۔ اپنی قوتوں کا ضیاع کرنے والی بہت سی تحریکوں کے مدفن ہر معاشرے کی گود میں پائے جاتے ہیں۔

عوام میں اسلام سے خوف زدگی | ایک اسلامی تحریک کا مقصدِ وجود ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو ایک نظامِ زندگی

کی حیثیت سے غالب کرے۔ کافر معاشرے میں ہو تو اس ہی سے چُن چُن کر سعید روحوں کو چھانٹے اور مومنین کا ایک جتھا بنا کر دین کے غلبے کی کوشش کرے۔ اور اگر نام نہاد مسلمان معاشرے میں ہو تو اس کے افراد میں اسلام کا فہم و شعور پیدا کر کے ان میں سے اپنے ایمان کے تقاضوں کا جواب دینے کی ہمت رکھنے والوں کو اُٹھائے اور انہیں اس کارِ دین پہ لگائے۔ اس طرح ایک تحریک بھاری اور عظیم تغیّر و انقلاب کی داعی و علمبردار بن کر اُٹھتی ہے اور وہ جہاں ایک طرف نظامِ غالب کی مطلق العنانی کے لیے ایک مجسم چیلنج ہوتی ہے وہاں اس معاشرے کے سارے ہی طبقات کو ایک نئے نظام کی طرف لے جانے کی داعی ہونے کی حیثیت سے ان کے لیے بھی ایک چیلنج ہوتی ہے۔

جو لوگ اسلام کا حقیقی فہم و شعور حاصل کر لیتے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ انسان اور اس کی انسانیت کی فلاح و سلامتی صرف اسلام میں ہی ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام کے تاریخی رول سے بے خبر ہوتے ہیں وہ کچھ اپنی کج فہمی کے سبب اور کچھ اسلام کے دشمنوں کے اُکسانے پر، اسلام کے نظام کے بارے میں خوف زدگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی میں عافیت محسوس کرتے ہیں کہ وہ جس حال میں پڑے ہیں بس اسی حالت میں پڑے رہیں اور کوئی انہیں تغیّر کی لہروں سے دوچار نہ کرے۔ یہ عافیت خواہی پھر بے شمار غلط فہمیوں کے ساتھ مل کر بدترین اندیشوں کا باعث بن جاتی ہے۔ انہیں اسلام میں بندہ و آقا کی مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ خدا اور رسول کی رحمتیں برستی نظر نہیں آتیں۔ اسلامی حکومت کے حکام کا گھر گھر تک پہنچ کر لوگوں کے حقوق ان تک خود پہنچانے کے اہتمام کا کوئی ادراک نہیں ہوتا۔ انہیں اسلامی نظامِ معیشت میں محتاجوں، مسکینوں، بے روزگاروں، قیدیوں، مسافروں، یتیموں، طالب علموں، بیواؤں، ضعیفوں، بوڑھوں، بے یار و مددگار حاجت مندوں کی دست گیری کے بے شمار اسباب اور ادارے تو دکھائی نہیں دیتے ہیں، بس اُنہیں ہر طرف، ہر جگہ اور ہر وقت کوڑے برستے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ گویا اسلامی نظام کے قیام کے بعد سارے جرائم انہیں کے حصے میں آئیں گے۔ انہیں ہر طرف ہاتھ کٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا پشتینی چوروں کے گروہ انہیں کی قیادت میں سرگرم کار رہتے ہیں۔ انہیں اُونچے پاجامے اور نیچے کُرتوں کا بے بنیاد غم کھاتا رہتا ہے۔ جب کہ اسلام نے لباس کی کوئی تراش اُصولِ سَتر کے سوا مقرر نہیں کی ہے۔ انہیں خوابوں میں خوفناک ڈاڑھیاں لہراتی دکھائی دیتی ہیں حالانکہ ان کے اپنے بچے اُن کے چاروں طرف یہی بنا اور ڈاڑھیاں لٹکائے پھرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں اسلام میں مادی ترقیات کے دروازے بند ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، حالانکہ اسلام اشرف المخلوقات کے لیے انفس و آفاق کی

فتوحات کے دروازے کھولتا ہے اور جنہوں نے سچے دل سے اسلام قبول کر کے اس پر عمل کیا تھا انہوں نے ساری دنیا کی صدیوں تک قیادت کی تھی اور آج مسلمانوں کے حصے میں موجودہ پس ماندگی اسلام کے سبب نہیں بلکہ اسلام سے دُوری کے سبب آئی ہے۔

غرض مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا علمبردار ایک گروہ اسلام سے خوف زدگی کی وبا طاعون کے چوہوں کی طرح پھیلاتا رہتا ہے اور معاشرے کے بھولے بھالے عوام اپنی بے خبری سے اور نفس پرست لوگ اپنی کمزوریوں کے سبب اپنے ہی دین سے دہشت زدہ ہو ہو کر کانپتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی اسلام سے دہشت و وحشت دُور کرنا ہر اس تحریک کا بنیادی فرض ہوتا ہے جو انہیں اسلام کے مقصد کے لیے اُٹھانا اور آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ وہ اگر عملی اسلام سے دہشت زدہ اور خوفزدہ ہو کر پیچھے اور دور دور رہیں گے تو تحریک سرگرمی اور فعالیّت سے محروم ہو جائے گی اور اس کا مقصدِ وجود فوت ہو جائے گا۔

ضروری وضاحت

ماہ اپریل کے ترجمان القرآن میں شاہ فیصل شہید پر اپنے مضمون کے آخر میں میں نے شاہ فیصل شہید کی پاکستان اور اہل پاکستان سے محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ گذشتہ سال حج کے موقع پر جب پروفیسر غلام اعظم سابق امیر جماعتِ اسلامی مشرقی پاکستان نے شاہ فیصل سے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ "مشرقی پاکستان کو پاکستان سے کاٹ کر بنگلہ دیش بنا دینا ہی غلط تھا اور مزید غلطی یہ ہے کہ اُسے ایک اشتراکی اور لادینی ریاست بنا دیا گیا ہے، لہٰذا جب تک دستوری طور پر بنگلہ دیش کو اسلامی ریاست کی حیثیت نہیں دی جاتی وہ اسے اس کفر کی حالت میں ہرگز تسلیم نہیں کریں گے"۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوا کہ پروفیسر غلام اعظم صاحب اور جماعتِ اسلامی کے بعض مخالف میرے اس بیان کی عبارت کو پیش کر کے سادہ لوح لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ دیکھو غلام اعظم صاحب بھی اندر سے بنگلہ دیشی ہیں اسی لیے تو شاہ فیصل کے بنگلہ دیش تسلیم نہ کرنے پر انہوں نے اعتراض کیا۔ حالانکہ معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی میرے بیان کو پڑھ کر یہ جان سکتا ہے کہ سوال کرنے والے (یعنی پروفیسر غلام اعظم صاحب) دراصل شاہ فیصل کی زبان سے یہ واضح کروانا چاہتے تھے کہ بنگلہ دیش کا وجود انہیں کیوں ناگوار ہے اور وہ اسے تسلیم کرنے سے کس بنا پر انکار کرتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ میرے بیان سے پروفیسر غلام اعظم یا جماعت اسلامی کے خلاف اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے حق میں کوئی دلیل لانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ صریح بددیانتی سے کام لے رہے ہیں۔

خلیل حامدی

رسائل و مسائل

خود کشی کرنے والے کی نماز جنازہ

ملک غلام علی

سوال:۔ ایک مولوی صاحب زور شور سے اس بات کا دعوٰی کرتے ہیں کہ خود کشی کرنے والے کا جنازہ پڑھنا حرام ہے۔ وہ اس بات کا ہر جگہ چرچا کرتے ہیں۔ آپ سے خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ آپ نے مختصر جواب دے کر ٹال دیا ہے کہ حدیث سے یہ ثبوت نہیں ملتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنے یا پڑھانے سے منع فرمایا ہو۔ آنحضورؐ نے خود نماز جنازہ نہیں پڑھائی یا یہ فرمایا ہے کہ میں تو نہیں پڑھاؤں گا۔ مگر وہ صاحب اسے جاہلانہ جواب کہتے ہیں اور خود کشی کرنے والے کے جنازے کو قطعی ناجائز اور ممنوع قرار دیتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ابو داؤد شریف، نسائی شریف، فتاوی عزیزیہ جلد اوّل۔ فتاوٰی نور الہدٰی طحاوی، جامع المرموز، بلوغ المرام، اسلامیات، جماعت نہم سب کتابوں میں خود کشی کے مرتکب کے جنازے کی اہمیت و ممانعت لکھی ہوئی ہے اور ان کے مصنف عدم جواز کے قائل ہیں۔ کشف الغمہ کا بھی حوالہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ نے یہ کتابیں نہیں دیکھیں یا پڑھ نہیں سکتے۔ براہ کرم اس کا مفصل جواب دیں کہ ایسے شخص کی نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں اور جو شخص جنازہ پڑھے گا یا پڑھائے گا کیا وہ گناہگار ہوگا جیسا کہ مولوی صاحب کا فتوٰی ہے۔ ہماری تشویش اور یہ جھگڑا اس وقت تک ختم نہ ہوگا جب تک جواب صاحبِ ضامنت سے نہیں دیا جائے گا۔

جواب:۔ خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا مسئلہ فقہاء و محدثین کے مابین مختلف فیہ ہے اور فقہاء حنفیہ کا بھی اس میں باہمی اختلاف ہے۔ لیکن میرے نزدیک قابلِ ترجیح مسلک یہی ہے کہ ایسے شخص کے لیے نماز جنازہ جائز ہے لیکن اسلامی معاشرے کے ذی وجاہت اور سربرآوردہ لوگ چاہیں تو جنازے میں شریک نہ ہوں۔ اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے کہ مومن گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا۔ جو شخص دائرہ اسلام و ایمان سے خارج نہیں ہوتا، میرے نزدیک جس طرح اس کے لیے دعائے مغفرت جائز ہے اسی طرح نماز جنازہ بھی جائز ہے، کیونکہ نماز جنازہ بھی دعائے مغفرت ہی کی ایک شکل ہے۔ قرآن مجید میں صرف مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت ہے یا پھر عہد نبوی میں جس شخص کا نفاق بالکل کھلا ہوا تھا اور جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم دیا گیا تھا صرف ایسے منافق کی نماز جنازہ سے آپ کو روکا گیا تھا۔ دوسرے کسی گناہ گار یا خطاکار کا جنازہ اگر آنحضورؐ نے خود نہیں پڑھایا تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض ایک زجر و توبیخ کی صورت تھی اور اس کی نوعیت بھی بعض اوقات عارضی تھی۔ یہ مقصود نہیں تھا کہ اس خطا کے مرتکب کا جنازہ کوئی دوسرا شخص بھی نہ پڑھے، بلکہ بعض حالات میں آپ نے صحابۂ کرام کو اس کا جنازہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ اس کی ایک نمایاں مثال مقروض کا جنازہ ہے۔ جب کوئی صحابی فوت ہوتے تھے تو آپ دریافت فرماتے تھے کہ ان پر قرض تو نہیں۔ اگر ہوتا تھا تو آپ جنازہ پڑھانے سے اجتناب فرماتے تھے مگر دوسرے صحابہ کو پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔ بعد میں ایسا بھی ہوا کہ کوئی صاحب ادائیگی قرض کا ذمہ لیتے تھے یا بیت المال سے اس کا انتظام ہو جاتا تھا اور آنحضورؐ جنازہ پڑھا دیتے تھے۔

اسی طرح کا معاملہ خودکشی کرنے والے کا بھی ہے۔ میرے علم میں کوئی حدیث صحیح ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتلِ نفس کا جنازہ پڑھانے کی ممانعت فرمائی ہو اور ایسے شخص کو جنازہ پڑھائے بغیر دفن کر دیا گیا ہو۔ جس جرم کے مرتکب کا جنازہ پڑھانے کی آنحضورؐ نے اجازت مرحمت فرما دی ہے اور صحابہ کرام کی جماعت نے جس کا جنازہ پڑھا دیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اس کے جنازے کی عام ممانعت کس بنا پر جائز ہو سکتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض فقہا نے خودکشی کرنے والے اور بعض دوسرے کبائر کا ارتکاب کرنے والے کا جنازہ نہ پڑھنے فتوٰی دیا ہے لیکن میں اس کے علی الاطلاق انطباق کو صحیح نہیں سمجھتا اور اس معاملے میں امام ابن حزم کی رائے کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں کہ بڑے سے بڑا گناہ گار بھی دعائے مغفرت اور جنازہ کا محتاج و مستحق ہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا خودکشی کرنے والے کے متعلق اتنا ہی حدیث میں وارد ہے کہ آنحضورؐ

نے اس کا جنازہ نہیں پڑھایا۔ صحیح مسلم، ابواب الجنائز کے آخر میں حضرت جابرؓ بن سمرہ سے اس سلسلے میں درج ذیل روایت ہے:

اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل قتل نفسہ بمشاقص فلم یصل علیہ۔

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے تیر یا برچھے کے ذریعے سے خودکشی کر لی تھی تو آپ نے اس کا جنازہ نہیں پڑھایا)۔

اس کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام اوزاعی کے نزدیک تو ایسے شخص کا جنازہ جائز نہیں، لیکن امام حسن بصری، امام نخعی، قتادہ، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور اہلِ علم کی اکثریت کے نزدیک اس کا جنازہ پڑھایا جائے گا۔ اس حدیث کی وضاحت میں ان سب فقہا نے فرمایا ہے کہ آنحضورؐ کا جنازہ نہ پڑھانا فقط لوگوں کے لیے ایک تنبیہ تھی کہ وہ اس گناہ کا ارتکاب نہ کریں اور صحابہ کرامؓ نے اس شخص کی نماز جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد امام نووی نے وہی مقروض کی مثال دی ہے اور قاضی عیاض کا قول نقل کیا ہے کہ تمام کے تمام علما کا مسلک یہی ہے کہ ہر مسلمان کا جنازہ پڑھا جائے خواہ اس پر حدِ شرعی نافذ ہوئی ہو، رجم کیا گیا ہو یا اس نے خودکشی کی ہو۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث ہے اور اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک صرف اتنا ہی منقول ہے کہ میں اس شخص کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاؤں گا۔ اس حدیث کی شرح میں امام خطابی نے فرمایا کہ اکثر فقہا کا قول یہ ہے کہ ایسے شخص کا جنازہ پڑھایا جائے گا اور حافظ منذری کے نزدیک بھی آنحضورؐ کا نماز نہ پڑھانا لوگوں کو ڈرانے کے لیے تھا۔

سنن ترمذی، کتاب الجنائز میں بھی اس طرح کی ایک حدیث وارد ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عن جابرؓ بن سمرۃ ان رجلا قتل نفسہ فلم یصل علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(حضرت جابرؓ بن سمرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے خودکشی کر لی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جنازہ نہیں پڑھایا)

اس کی تشریح میں امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ بعض کا مسلک یہ ہے کہ ہر مسلمان حتیٰ کہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ بھی جائز ہے اور امام احمد کا قول یہ ہے کہ امام وحاکم تو جنازہ نہ پڑھائے لیکن دوسرے پڑھ لیں۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے اپنی شرح تحفۃ الاحوذی میں پہلے امام نووی کی مذکورہ بالا عبارت نقل کی ہے اور پھر امام شوکانی کا قول نیل الاوطار کے حوالے سے درج کیا ہے کہ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور جمہور علما کے نزدیک فاسق کا جنازہ بھی جائز ہے۔ اور خودکشی کرنے والے

کا جنازہ اگرچہ آنحضورؐ نے نہیں پڑھایا مگر صحابہ کرام نے اس کی نماز جنازہ پڑھی ہے اور اسی کی تائید سنن نسائی سے بھی ہوتی ہے کیونکہ آنحضورؐ کا صرف یہ ارشاد منقول ہے:

اما انا فلا اصلی علیہ — جہاں تک میرا تعلق ہے میں جنازہ نہیں پڑھاؤں گا۔

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو جنازہ نہیں پڑھایا مگر صحابہ کرام کو فرض کفایہ ادا کرنے کی اجازت دے دی۔

جیسا کہ میں نے شروع ہی میں لکھا ہے کہ فقہائے حنفیہ کے اقوال بھی دونوں طرح کے پائے جاتے ہیں لیکن میرے نزدیک زیادہ صحیح اور قابل ترجیح قول جواز ہی کا ہے۔ درمختار میں ہے:

من قتل نفسہ ولو عمداً یغسل ویصلی علیہ، بہ یفتی

(جس نے خودکشی کی خواہ جان بوجھ کر کی اُسے غسل دیا جائے گا اور اس کا جنازہ پڑھایا جائے گا، فتوٰی اسی پر ہے)

اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے امام ابن عابدین رد المحتار میں فرماتے ہیں کہ جن علماء نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ نہ پڑھانے سے ممانعت کا استدلال کیا ہے، ان کے حق میں حدیث سے دلالت نہیں ملتی۔ حدیث میں محض یہ آیا ہے کہ آنحضورؐ نے جنازہ نہیں پڑھایا جس سے فہمائش مقصود ہے۔ یہ ذکر نہیں کہ صحابہ کرام نے بھی جنازہ نہیں پڑھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ پڑھانا اور دوسروں کا نماز جنازہ پڑھانا یکساں نہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ایسا شخص تائب نہ ہو سکے گا یا اس کی توبہ قبول نہ ہو سکے گی، کیونکہ توبہ تو ہر عاصی بلکہ کافر کی بھی قبول ہو سکتی ہے۔

صاحبِ رد المحتار کا یہ قول بالکل صحیح اور بجا ہے۔ ایک شخص جو مسلمان ہے اور جس کی تکفیر کے لیے واضح وافر وجوہ موجود نہیں ہیں، اُسے اس عام حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا جو ہر مسلمان کے لیے نصوص شرعیہ سے ثابت ہے اور حدیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق بیان فرمائے گئے ہیں ان میں اس کا جنازہ پڑھنا بھی شامل ہے۔ پھر جس معاشرے سے ہمیں سابقہ درپیش ہے، اُسے بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ اس میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج جیسے فرائض کے تارک ہیں۔ قاتل، شراب خوار، زناکار اور مرتکب کبائر ہیں۔ ان سب کا جنازہ پڑھ لینا اور صرف خودکشی کرنے والے کا جنازہ نہ پڑھنا اور دوسروں کو اس سے روکنا عجیب چیز ہے۔ بلاشبہ اگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف حکم دے دیا ہوتا کہ خودکشی

کرنے والے یا فلاں دوسرے کبیرہ گناہ کرنے والے کا جنازہ کوئی مسلمان نہ پڑھے تو ہم ہرگز اس کی خلاف ورزی کی جسارت نہ کرتے لیکن ایسی واضح ممانعت کی عدم موجودگی میں صحیح اور تحقیقی قول اور محتاط عمل یہی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شخص کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہتے تو نہ پڑھیں لیکن جو شخص کا فر اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں اُس کے جنازہ کی ممانعت کا فتویٰ نہ دیں اور دوسروں کو اس کا جنازہ پڑھنے سے نہ روکیں۔

جو مسلمان کفار سے قتال کرتا ہوا جامِ شہادت نوش کرتا ہے، اس کے متعلق بھی حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اس کا جنازہ پڑھنا واجب ہے لیکن متعدد دیگر ائمہ فقہا و محدثین کے نزدیک اس کا جنازہ نہیں پڑھا جائے گا اور اسے غسل بھی نہیں دیا جائے گا بلکہ ایسے شہید کو خون آلود کپڑوں ہی میں دفن کر دیا جائے گا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہے کہ اس دوسرے مسلک کے حق میں صحیح تر احادیث موجود ہیں، اگرچہ احناف کے حق میں بھی روایات ملتی ہیں۔ بہرکیف شہید کا معاملہ خاص ہے جس پر کسی دوسرے مرنے والے بالخصوص خودکشی کرنے والے کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ شہید کے پہلے قطرۂ خون کے ساتھ اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں جیسا کہ حدیث نبوی میں تصریح ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مقتول فی سبیل اللہ کی تعظیم و تشریف اور اس کی یقینی مغفرت کے پیشِ نظر اُسے جنازے سے مستثنیٰ رکھا گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میری اس بحث کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھا جائے کہ میں خودکشی کو ایک معمولی لغزش سمجھتا ہوں۔ خودکشی بہرحال قتلِ نفس اور ایک کبیرہ گناہ ہے۔ احادیث صحیحہ میں اس پر جہنم کی وعید مذکور ہے اور آنحضورؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس آلۂ قتل سے کوئی شخص اپنی جان لیتا ہے، دوزخ میں وہی اس کے لیے آلۂ عذاب بن کر اس پر دائماً مسلط کر دیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے وہ بار بار خودکشی کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہ فعل انتہائی بزدلی اور اپنے اللہ سے بدگمانی اور ناشکری پر دلالت کرتا ہے جو ایک مسلمان کے لیے کسی حال میں جائز نہیں۔ ایک انسان اپنی جان کا خود خالق و مالک نہیں کہ جب چاہے، جس طرح چاہے، اُسے ضائع کر دے۔ تاہم ایسا بدنصیب شخص اگر مسلمان ہے تو اس کا جنازہ میرے نزدیک جائز ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ اُسے معاف فرما دے خواہ سزا کے بعد ہی معافی کی نوبت آئے۔

مطبوعات

ایقاظ ھمم اولی الابصار (عربی)	مؤلف : الشیخ الامام صالح بن محمد العمری الشہیر بالفلانی ناشر : دار نشر الکتب الاسلامیہ - ۱۹ - گورونانک پورہ - گوجرانوالہ

سفید ولایتی کاغذ ۱۸۴ صفحات سائز ۶½" × ۱۰"

عربی ٹائپ فوٹو آفسٹ طباعت قیمت : ۱۵/- روپے

جمہور علمائے امت اصولی طور پر تو قرآن و سنت، اجماع و اجتہاد اور قیاس کے مصدر و ماخذ ہونے پر متفق ہیں مگر طریق اخذ و استنباطِ مسائل کے باب میں کچھ اختلاف ضرور پایا جاتا ہے۔ بعض علماء مذکورہ بالا ماخذ سے براہِ راست استنباط مسائل کے قائل ہیں تو کچھ دوسرے حضرات کسی خاص امام کی وساطت سے احکام و مسائل معلوم کرنا بہتر خیال کرتے ہیں۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اپنے امام معین کے مسلک کے معاملہ میں جانبداری برتتے ہیں۔

تقلید مذاہب کے ضمن میں مقلدین کے ہاں فقہائے اسلام کی حد تک عموماً اور فقہائے اربعہ کے معاملے میں خصوصاً جس عصبیت کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے اور آج بھی جس کا سلسلہ جاری ہے اس سے اجتناب و تحذیر اسی کتاب کا اصل موضوع ہے۔

زیرِ نظر تالیف میں امام موصوف نے قرآن پاک، احادیث صحیحہ، اقوال صحابہ و تابعین اور ارشادات ائمہ کی روشنی میں قیاس، رائے اور تقلید کی حقیقت بیان کی ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ کس حد تک ان کا وجود صحت مند ہے اور کس مقام سے غلو کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کا سب سے زیادہ جاندار حصہ وہ ہے جس میں ائمہ اربعہ میں سے ایک ایک کے ارشادات در باب قیاس، رائے اور تقلید بیان کیے گئے ہیں اور جہاں اس امر کی وضاحت ملتی ہے کہ خود ان ائمہ کی نظر میں حدیثِ رسولؐ کے سامنے آجانے کے بعد ان کے

اپنے قول کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ؟

اس کتاب میں اکثر و بیشتر زور اس بات پہ دیا گیا ہے کہ عملی زندگی میں مسلمانوں کو براہ راست رسول پاکؐ کی اتباع کرنی چاہیے اور ان کے بعد خلفائے راشدین کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ اور جن مسائل میں رسول پاک کی طرف سے واضح اور متعین صورت میں رہنمائی ملتی ہے ان میں آپ کی رہنمائی کو نظرانداز کرکے دوسروں کے اقوال کا اتباع کسی طرح بھی علمائے اسلام کے لیے مناسب نہیں۔

ادارہ نے اس کتاب کو نہایت عمدہ معیار طباعت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بلند پایہ مگر نایاب عربی تالیفات کی اشاعت —— جو اس ادارہ کا مقصد ہے —— بڑی مفید علمی خدمت ہے اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ملتِ اسلامیہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اقبال کی طویل نظمیں از رفیع الدین ہاشمی صاحب

ناشر: گلوب پبلشرز اُردو بازار لاہور۔

کتابت طباعت گوارا - سفید کاغذ - صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد ۵۰/۷ روپے

علامہ اقبال کی شاعری محض حسن تخیل اور حسنِ بیان ہی سے عبارت نہیں بلکہ ایک بیدار مغز مسلم مفکر ہونے کی حیثیت سے موصوف نے شاعری کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا اور اپنے ابنائے نوع کے نام اُن کا پیغام وہی تھا جو خدا اور رسولؐ نے نسل انسانی کو دیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ مرحوم کی ہر نظم اپنے اندر ایک مقصدیت رکھتی ہے مگر ان کے پیش نظر مقصد کو زیادہ بہتر طریقہ سے ان کی طویل نظمیں پورا کرتی ہیں۔

زیرِ نظر تالیف میں شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضر راہ، طلوعِ اسلام ذوق و شوق، مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ ابتدا میں ہر نظم کا مختصر تعارف اور پس منظر بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا فکری جائزہ لینے کے لیے فنی تجزیہ کیا گیا ہے جو مفید معلومات سے آراستہ و مزین ہے۔ چونکہ مؤلف نوجوان طلبہ کو اقبال کی مذکورہ بالا نظمیں سمجھانا چاہتے ہیں اس لیے توضیح و تنقید کا انداز آسان ہے۔

ہماری رائے میں "اقبال کی طویل نظمیں" پیغامِ اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایک مفید کاوش ہے۔

حصولِ پاکستان تالیف، پروفیسر احمد سعید صاحب

شائع کردہ: ایجوکیشنل امپوریم - ۶۲ چیمبرلین روڈ، لاہور

صفحات: ۳۶۶ قیمت: -/۹ روپے

اس کتاب کے نوجوان مصنف علمی دنیا کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ تحریک پاکستان کے متعلق خصوصاً اس تحریک میں علماء کے کردار کے بارے میں وہ پہلے ایک قابلِ قدر تصنیف پیش کر چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی دیدہ وری کے ساتھ تحریک پاکستان کے ارتقاء سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں سرسید اور اُن کے رفقاء کے کار، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور اُن کے خلفاء مولٰینا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا محمد شفیع صاحب، اور دوسرے مسلم زعماء مثلاً سید امیر علی، مولانا محمد علی جوہرؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ایک کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس میں اُس نامور مفکر کا ذکر نہیں جس نے مسئلہ قومیت لکھ کر نہ صرف مسلمانوں کو الگ قومیت کا صحیح شعور عطا کیا بلکہ کانگرس کے پیش کردہ وطنی قومیت کا طلسم چاک کیا۔ یہ اسلامی قومیت کے اس شعور کا نتیجہ تھا کہ تحریک پاکستان کو پائیدار علمی بنیاد فراہم ہوئی جس کی وجہ سے اس میں غیر معمولی قوت پیدا ہوئی۔

کتاب معلومات افزا ہے اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے۔ قیمت بھی بڑی مناسب ہے۔

ملکہ ثریا کا قتل تالیف: جناب ریاض الرحمن صاحب

شائع کردہ: بک سنٹر حیدر روڈ، راولپنڈی صدر

صفحات: ۲۰۸ قیمت: -/۵ روپے

یہ ایک ناول کے انداز میں پُر اسرار کہانی ہے جس کا موضوع اور اسلوب بیان ناول کا سا ہے۔ فاضل مصنّف نے اس میں ایک جدت یہ ضرور پیدا کی ہے کہ آغاز میں مباحثے کا ایک منظر دکھایا ہے جس میں ایک اشتراکیت پسند دوشیزہ اور اسلام کا ایک نوجوان داعی دونوں اپنے اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرتے ہیں۔ مصنّف کے پاکیزہ عزم اور خیالات کے احترام کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ داستان فن اور زبان دونوں اعتبار سے کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں۔ ناول نگاری

ایک فن ہے اور اس میں وعظ و نصیحت کا سا انداز اس فن کو مجروح کرتا ہے۔ پھر مباحثے کو پلاٹ کے اندر جس طرح سمونے کی کوشش کی گئی ہے وہ بھی کامیاب نہیں اور وہ پلاٹ سے الگ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ انداز بیان تقریر کا سا ہے اور اس میں نامانوس تراکیب کا استعمال اسے بوجھل بنا دیتا ہے۔ مثلاً متاثر کن ص۲، جسمانی ملکیتوں ص۱۰۔ رمیز کی یہی وہ نظر ہوتی تھی جو مرتبہ ولایت سے کچھ ہی کم مقام رکھتی تھی ص۱۵، ان جنوں کی مختلف مذہبی جنگوں ص۲۹۔ یہ ساری نصیحت بازیاں اور دعوتیں یا ارادتاً جھوٹ کی نیت سے پیدا کی گئی ہیں ص۳۵۔ ان کے علاوہ ص۲۳ پر بیچارے مولوی کی جو کردار کشی کی گئی ہے وہ بھی طبیعت پر ناگوار گزرتی ہے اور حقیقت پسندی کے لحاظ سے بھی محل نظر ہے کیونکہ یہ غریب طبقہ نوجوانوں کی نصابی اور زائد از نصابی سرگرمیوں میں بہت کم ہی دخیل ہوتا ہے۔

صحیح مسلم
جلد چہارم

مترجم: عبدالحمید صدیقی
شائع کردہ: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار۔ لاہور

صفحات: ۴۰۰ قیمت: ۵۵/- روپے مجلد

زیر تبصرہ کتاب صحیح مسلم کے انگریزی ترجمہ مع حواشی کی آخری جلد ہے۔ یہ جلد کتاب السلام، کتاب الشعر، کتاب الرؤیا، کتاب الفضائل، کتاب البر والصلۃ والاداب، کتاب القدر، کتاب العلم، کتاب الذکر والدعاء، کتاب الرقاق، کتاب التوبۃ، کتاب الفتن، کتاب التفسیر پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک مفصل اشاریہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

(بقیہ اشارات) کیا جاسکتا۔

پھر اسلام کے ان عقیدت مند حکمرانوں کی دینِ حق سے انحراف کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اس نہج پر ڈھالنے کے لیے آمادہ نہیں پاتے، جس کا اسلام تقاضا کرتا ہے۔ اس بنا پر اُن کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اسلام کے ساتھ ان کی محبت صرف تقریروں اور بیانات تک محدود رہے اور انہیں اس محبت کے نتیجے میں عملاً کچھ نہ کرنا پڑے۔ دینِ حق کے بارے میں یہ طرزِ عمل کسی صحت مند طرزِ فکر کی نشاندہی نہیں کرتا۔

اسلام کے معاملے میں پیپلز پارٹی کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ دین سے جو بیزاری پہلے محتاط جملوں کی صورت میں سامنے آتی تھی اب وہ اس کی کاوشوں سے نعروں کی صورت میں ڈھل کر اور منشور کے اندر تحلیل ہو کر عوام کے سامنے آنے لگی ہے۔ "اسلام ہمارا دین ہے۔ سوشلزم ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے" کا نعرہ اپنے معانی اور مضمرات کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہے کہ ایک پارٹی اللہ کے دین کی وسعت اور جامعیت کا انکار کرتے ہوئے یہ بات برملا کہتی ہے کہ خدا کا لایا ہوا دین معیشت اور سیاست کے معاملے میں ہمیں کوئی رہنمائی نہیں دے سکتا۔ حیات انسانی کے ان دائروں میں سوشلزم اور مغربی جمہوریت ہی ہماری دستگیری کر سکتے ہیں۔ اس پارٹی کے بعض دانشور اپنے اس کارنامے پر بڑا اتراتے ہیں کہ انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کر کے اسلام کے معاملے میں اس منافقانہ روش کو ختم کیا ہے جو ان کے پیشرو عرصہ دراز سے اختیار کیے ہوئے تھے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ حضرات جس منافقت کا شکار ہیں وہ پہلی قسم کی منافقت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ اِس میں قول و فعل کے تضاد کے علاوہ ایک خوفناک قسم کا فکری انتشار بھی پایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے تو وہ درحقیقت اسلام اور کفر کو یکجا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی رہی یہ تاویل کہ وہ جس سوشلزم کے پرچارک ہیں وہ اسلام کے تابع ہے تو یہ اسی قسم کی سخن طرازی ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ وہ جس بُت پرستی کا علمبردار ہے وہ اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہے۔ سوشلزم کے یہ پُرجوش مبلغ ہر وقت اپنے ناقدین پر برستے رہتے ہیں اور جو دعوے کی حد تک نفاق سے نفرت کا اظہار کرتے رہتے ہیں وہ خود نفاق کے مرض میں گرفتار ہیں۔ کیا یہ دورنگی اور منافقت نہیں کہ ایک انسان سوشلزم اور اس کے نظریات اور معتقدات کا پرستار ہو اور اس بنا پر وہ ان تمام افراد، قوموں اور اداروں کو مٹانے کے درپے ہو جو سوشلزم کی راہ کا سنگِ گراں ثابت ہو سکتے ہوں

لیکن عوام کے احساسات کے پیش نظر وہ سوشلزم کا نعرہ بلند کرتے ہوئے یہ کہے کہ میرے نزدیک اس کا مطلب عدل وانصاف کے وہ تصورات ہیں جن کی اسلام نے نشاندہی کی ہے۔ یہ اسلام کے بارے میں منافقت نہیں تو اور کیا ہے۔ ان حضرات کے بارے میں یہ سوئے ظن نہیں ہو سکتا کہ وہ اِس اصطلاح کے معانی و مطالب سے عدم واقفیت کی بنا پر ایسی بے تکی باتیں کر رہے ہیں۔ اشتراکیت عدل وانصاف اور احسان کا نام نہیں بلکہ انسانوں پر اجتماعیت کی جھوٹی خدائی قائم کرنے کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، انسان بحیثیت فرد کسی مرتبہ و مقام کا حامل نہیں اور نہ اس اعتبار سے اس کے کوئی مستقل اور پائیدار حقوق ہیں — اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی معاشرے کی ہیئت حاکمہ اس سے جو کام لینا چاہے وہ بلا چون وچرا کرتا چلا جائے اور اسے جس حال میں رکھنا گوارا کرے وہ اسی حال پر قانع رہ کر زندگی کی سرحد کو عبور کر جائے۔ الغرض وہ ہیئت حاکمہ کے لیے جیے اور اسی کی خدمت اور چاکری میں مرے۔ نمرود کی خدائی کی اس سے زیادہ بھیانک صورت کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی مظلوم فرد یا طبقہ نہ تو ظلم کو ظلم کہہ سکے اور نہ ظلم کے خلاف کوئی آواز اٹھا سکے اور اگر کبھی وہ اس غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے تو اسے معاشرے اور اجتماعی مفادات کا باغی گردان کر ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اشتراکیت انسانی فلاح و بہبود کی کوئی تحریک نہیں بلکہ انسانیت کے خلاف ایک [illegible] سازش ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی دینی معاشرے میں جو مقام خدا کو حاصل ہوتا ہے [illegible] مقام پر ملک کی ہیئت حاکمہ کو فائز کر دیا جائے اور انسان اس کے ساتھ اسی نوعیت کا رشتہ عبودیت استوار کریں جس طرح کہ خدا پرست اپنے خالق اور مالک کے ساتھ استوار کرتے ہیں۔
